یکے از مطبوعاتِ بزمِ اقبال، لاہور

علامہ اقبال

از

آقای مجتبیٰ مینوی

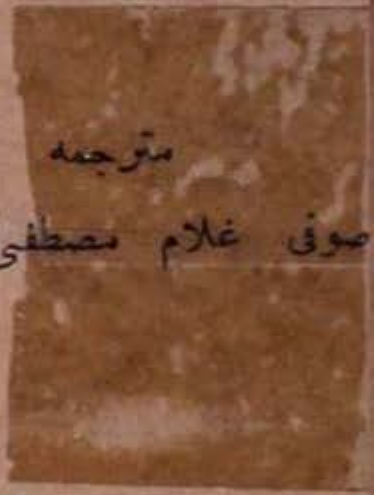

مترجمہ

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

891.43109
م ی ن

بزمِ اقبال
نرسنگھ داس گارڈن
- کلب روڈ -
لاہور

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

مسٹر کریم احمد خان طابع و ناشر و معتمد بزم اقبال نے رپن پریس
بل روڈ ، لاہور سے چھپوا کر دفتر بزم اقبال ، ۲ نرسنگھ داس
گارڈن ، کلب روڈ ، لاہور سے شائع کیا ۔

به شکریه و اجازت فاضل مصنف

آقای مجتبیٰ مینوی

پیش لفظ

عہد وسطیٰ میں اسلامی سلطنت اپنے انتہائی عروج پر تھی ، ایشیائے کوچک سے لے کر بنگال کے مشرقی حدود تک ساری کی ساری سرزمین اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ لسانی اشتراک نے معاشرتی ارتباط کی بنیادوں کو اور بھی استوار کر دیا تھا۔ ایک سیاح بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں سے نکل کر ایران و ہندوستان کے کسی گوشے میں بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔ مغلیہ دور حکومت میں ہزارہا ہستیاں ایران کی سرزمین سے ہندوستان میں وارد ہوئیں اور اُن کا آنا ایسا تھا جیسے کوئی انسان وطن کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے میں پہنچ جائے ۔ عرفی شیرازی ۔ نظیری نیشاپوری اور ملک قمی، دھلی، گجرات اور دکن میں رہ کر بھی پردیسی نہ بن سکے ۔ اُن کے شاعرانہ نغمے اس دیس میں اس رسیلے پن سے لہلہائے گویا ایران کی رنگین فضا میں سانس لے رہے تھے ۔

ایران و ہندوستان کی یہ تہذیبی اور ثقافتی یگانگت صدیوں تک قائم رہی ۔ دھلی کی مرکزی حکومت کے انحطاط سے ان دو عظیم الشان ملکوں کا باھمی رشتہ ٹوٹنے لگا اور باھمی مغائرت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ھمارے ملک میں ایک غیر قوم کے سیاسی تسلط نے ھمارے معاشرتی نظام کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور قدیم تہذیبی روایات ڈگمگانے لگیں۔ ایران سے ھمارے لسانی اور ادبی روابط اور بھی ڈھیلے پڑ گئے ۔ دونوں ھمسایوں میں بیگانگی سی پیدا ھو گئی ۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایران کے سیاسی اُفق پر انقلاب کی گھٹائیں ابھر آئیں ۔ فارسی ادب نے بھی ایک کروٹ لی اور اس میں بیداری

اور نئی زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے نے دوسرے ملکوں کی طرح ایران کی بھی کایا پلٹ دی اور ادب ایران میں نئے رجحانات نے جنم لیا۔ ہند و پاکستان کی سرزمین میں اُردو زبان و ادب بھی انہی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ حالی اور آزاد کے بعد اکبر اور اقبال کی شاعری نئی فضا میں گونج رہی تھی۔ اس باہمی مماثلت نے ایران و ہندوستان کو پھر ایک بار ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا۔ بین‌الاقوامی تعلقات کے ہمہ گیر اثرات نے اس قرب کو تقویت دی۔

تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے ایران سے ثقافتی وفد اس سرزمین میں وارد ہوئے اور اُن کی آمد سے اس دیس کے رہنے والوں کی فارسی زبان و ادب سے شغف کا چرچا اہل ایران کی نظر میں پھر ایک بار تازہ ہوا۔ پنجاب اور بالخصوص لاہور میں علامہ اقبال مرحوم کی شاعری کی عظمت اور بھی نمایاں ہوئی۔ فی‌الحقیقت یہ دو متوازی ادبی تحریکوں کے جدید رجحانات کی ہمرنگی کا کرشمہ تھا۔ خود علامہ مرحوم کے افکار عالیہ بھی اتنے جاذب تھے کہ دیکھنے اور سننے والوں کی توجہ خود بخود اُدھر منعطف ہوئی۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد علامہ کی شاعری، اُن کا فکر سخن اور فنی محاسن کا چرچا عام ہوا اور اہل ایران اور بالخصوص دانشکدۂ طہران کے معلم اور ملک کے مقتدر اور اہل نظر حضرات نے اُن کے کلام کو غور اور توجہ سے دیکھنا شروع کیا، جن میں ملک الشعرا بہار مرحوم، آقائے دھخدا، ڈاکٹر سعید نفیسی، ڈاکٹر صورتگر، آقائے علی‌اصغر حکمت، ڈاکٹر بیانی، آقائے سرمد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان صاحب نظر بزرگوں نے اپنے تحریری بیانات اور ارشادات سے علامہ اقبال مرحوم کے بلند افکار اور اُن کے کلام کی لسانی اور فنی خوبیوں کو اجاگر کیا اور اپنے ہموطنوں کے دل سے اس تعصب، تنگ نگاہی اور غلط فہمی کو دور کرنے کی سعی و کوشش کی جو عام طور پر اہل زبان کے

دل میں اجنبی ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ یہ ایک نہایت قابل ستائش اقدام تھا۔

اسی گروہ میں سے ایک بزرگ آقائے مجتبیٰ مینوی ہیں جو کتاب ھذا کے مصنف ہیں۔

اس کتاب کے مصنف آقای مجتبیٰ مینوی طہران یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور تاریخ پڑھاتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی علوم و ادبیات میں یکساں مزاولت رکھتے ہیں اور اپنی مادری زبان ، فارسی ، کی طرح انگریزی بھی بے تکلف بولتے ہیں۔ عربی اور فارسی علوم اور ادبیات سے انہیں خاص شغف ہے اور اس بارے میں ان کا تبحر علمی قدما کی یاد دلاتا ہے۔ وہ خود بھی پاکیزہ اور شستہ ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ میں نے انہیں عربی ، فارسی اور انگریزی اشعار بے تکلف بولتے دیکھا ہے۔ قدیم روایات سے بہرہ اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جدید ادبی اقدار سے بھی کماحقہ آشنا ہیں اور ان کی یہ تصنیف اسی ادبی ذوق کا ایک عملی نمونہ ہے۔

''اقبال لاہوری'' کسی گہری ادبی تحقیق کا نتیجہ نہیں۔ اس میں کلام اقبال پر کوئی سیر حاصل تنقید بھی نہیں کی گئی بلکہ مصنف نے علامہ مرحوم کی تعلیمات کا خلاصہ اور اس کے ساتھ ان کی لسانی مہارت ، اور ادبی شعور اور اسلوب کو سرسری طور پز اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ وہ مشرق کے اس بڑے مفکر اور شاعر سے روشناس ہوسکیں۔

جیسا کہ مصنف نے کتاب میں خود بیان کیا ہے موجودہ ایران ، ہند و پاکستان کی ادبی سرگرمیوں سے تقریباً نا آشنا ہے۔ وہاں مرزا غالب، خواجہ عزیزالدین ، شبلی اور گرامی اور خود علامہ اقبال سے عوام بالکل بے خبر ہیں۔ غالب اور اقبال سے عام دلچسپی کا اظہار ابھی تازہ تازہ ہے

اور یہ کتاب اسی اظہار کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اس کے مصنف سے کسی مبسوط اور جامع تنقیدی بیان کی توقع بے کار تھی۔ در اصل یہ کام ہمارا تھا جو آقائے مجتبیٰ مینوی نے کیا اور یہ اُردو ترجمہ اُنکی خدمت کا ایک اعتراف ہے جو ہماری طرف سے کیا جارہا ہے اور یہی اعتراف اس کتاب کے طبع ہونے کا جواز بھی ہے۔ امید ہے کہ آقائے مینوی کی یہ کوشش اس ضمن میں ہمارے لیے اور بھی بہت سی ادبی اکساہٹوں کا موجب ہوگی۔

ترجمہ کرتے وقت مجھے بعض جگہ مصنف سے اختلاف کے پہلو بھی نظر آئے لیکن میں نے انہیں بالعموم نظر انداز کر دیا ہے سوائے چند ایک مقامات کے جہاں اس کا اظہار نہایت ضروری تھا۔

میں ادارۂ ''بزم اقبال'' کے ارکان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کتاب کے ترجمے کا کام سپرد کر کے اُس عقیدت کے اظہار کا موقع دیا جو علامہ مرحوم کے متعلق ہمیشہ سے میرے دل میں رہی ہے۔

لاہور ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء

صوفی تبسم

پاکستان کا فارسی گو شاعر

سرود رفتہ باز آید کہ ناید　　پیامی از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے این فقیری　　دگر دانای راز آید کہ ناید

آٹھ سو سال تک فارسی زبان کو سرزمین ہندوستان میں رواج اور فروغ حاصل ہؤا اور چند صدیوں تک یہ زبان یہاں کے بادشاہوں کی درباری زبان بھی رہی - ہند کے مشہور و معروف شعراء نے اس میں شعر بھی کہے - ایران کے شعراء اور ادباء کی ایک کثیر تعداد ایران سے ہندوستان میں وارد ہوئی اور اس زبان میں متعدد کتابیں نثر میں تصنیف ہوئیں - یہاں کے سلاطین کے حکم سے بعض ہندی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ بھی ہؤا - ہماری ادبی وراثتوں میں سے بہت سی کتابیں، جو پہلی بار مطبوعہ صورت میں آئیں، ہندوستان ہی کی سرزمین سے ہمیں دستیاب ہوئیں - لیکن بے حد افسوس کا مقام ہے کہ ہند و ایران کا یہ ادبی ارتباط بر قرار نہ رہ سکا اور اس آخری ایک سو سال کے عرصے میں ان دو قوموں کے باہمی تعلقات کا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا - میں سمجھتا ہوں کہ ان تعلقات میں جو ضعف اور فتور پیدا ہؤا، اس کے بیشتر ذمہ دار اور قصوروار ہمیں لوگ تھے، کیوں کہ جہاں ہندوستان میں مرزا اسد اللہ غالب، ملا طاہر غنی، فارسی میں شعر کہتے تھے اور شبلی نعمانی شعر العجم لکھ رہے تھے اور عبیدی سہروردی فارسی صرف و نحو مدون کرنے میں مصروف تھے، ایران میں ہندوستان کے علوم، تاریخ، جغرافیہ یا ادبیات پر ایک کتاب بھی شائع نہیں ہوئی - ہندوستان کے ریاضی دان یورپ میں مشہور ہیں - لیکن ایران میں کسی نے ان کا نام تک نہیں سنا - ہندوستان کے دو جلیل القدر شاعر، رابندر ناتھ ٹیگور اور علامہ محمد اقبال

دنیا کے شعراء اور فلاسفہ میں شمار ہوتے ہیں ۔ لیکن ایرانی ان سے بے خبر ہیں ، سوائے اس کے کہ آج سے کوئی بارہ تیرہ برس پہلے ٹیگور نے حکومت ایران کی دعوت پر ایران کا سفر کیا اور وہاں چند تقریریں کیں ، اس کی ایک کتاب کا فارسی میں ناقص سا ترجمہ بھی شائع ہؤا ، اور اگر میں غلطی نہیں کرتا ، علامہ اقبال کے بارے میں ایک مختصر سا مقالہ کسی ایک فارسی کتاب میں طبع ہؤا اور وہ زیادہ تر ان کے استعمال کیے ہوئے فارسی الفاظ و تراکیب کی خردہ گیریوں پر مشتمل تھا ۔ اس مقالے کے علاوہ جہاں تک مجھے علم ہے ، ۶۴ صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ فارسی میں چھپا ہے اور وہ بھی ایک خطبے کی صورت میں ہے جو آقای سید محمد علی داعیٔ اسلام نے حیدرآباد دکن میں شعبۂ جامعۂ معارف میں دیا تھا ، اور شاید ہی کسی نے ایران میں اس رسالے کو دیکھا ہو ۔

علامہ اقبال کے ادبی آثار اور افکار و اشعار کے بارے میں ہماری بے خبری اور بے اطلاعی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آقای دھخدا نے اپنی تصنیف ''کتاب امثال و حکم*'' میں کہیں بھی ان کا ایک شعر یا ایک سطر درج نہیں کی ، حالانکہ ایران کے متعدد مشاعروں اور قافیہ بندوں کا کلام جس میں مضمون کی تازگی نام کو نہیں ، حکمت و مثل کے طور پر درج کیا گیا ہے ۔ ایک روز ایک دوست سے اقبال اور اس کے کلام کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک محترم بزرگ جن کا کام لوگوں کی عیب جوئی اور برائی کے سوا کچھ بھی نہیں اور دنیا کے تمام معاملات میں اپنے آپ کو باخبر اور صاحب رائے خیال کرتے ہیں اس گفتگو میں شریک ہوگئے اور فرمانے لگے ''ہاں ، ہاں میں جانتا ہوں ، وہی اقبال جس نے کتاب راحت الصدور کو شائع کیا ہے'' ۔ ہم نے کہا کہ وہ محمد اقبال جو شاعر اور

* یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے ۔ اس فاضل مصنف نے فارسی امثال اور اقوال کے مآخذ اور استناد پر بحث کی ہے ۔ اور اساتذہ کے کلام نظم و نثر سے اسناد بھی پیش کی ہیں ۔

فلسفی ہے آں محمد اقبال سے جس نے محمد راوندی کی کتاب راحت الصدور کو لیدن میں اور صدر الدین حسینی کی تصنیف اخبار الدولة السلجوقیه کو لاہور میں شائع کیا ہے، الگ ہستی ہیں، مؤخر الذکر پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر* ہیں۔ اس گفتگو کے بعد میرے دوست نے اقبال کا یہ قطعہ پڑھا :-

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسی زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت ہستم اگر میروم، گر نروم نیستم

میرے دوست نے کہا: ''دیکھو کتنا اچھا مضمون ہے! ساحل ساکن اور معطل ہے اس لیے ہیچ ہے اور موج چونکہ ہمیشہ حرکت اور جوش میں رہتی ہے اس لیے اس کا وجود قائم ہے۔ اگر الفاظ کی ترکیب ذرا زیادہ پختہ اور حسین ہوتی تو شعر زیادہ بلند ہوتا۔'' ہمارے وہ محترم بزرگ جو بڑا ادعا رکھتے تھے، اس گفتگو میں جو ان سے متعلق نہ تھی، کود پڑے اور فرمانے لگے ''نہیں، نہیں، خرامیدن کے معنی آہستہ اور نرمی سے چلنا ہے اور ''تیز خرامید'' میں ''تیزی'' اور ''خرام'' دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور یہ بات غلط ہے۔ مجھے بے ساختہ ایک مشہور حکایت یاد آگئی۔ ایک دفعہ حضرت عیسیٰ* اپنے حواریوں کے ساتھ ایک گندگی کے ڈھیر کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وہاں ایک کتے کی لاش بھی پڑی تھی اور اس کی عفونت اور گندی بو سے آنے جانے والوں کو سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ حواریوں نے ناک بھوں چڑھائی لیکن

---

* اس طرح کے مغالطے یہاں بھی بعض باخبر بلکہ بے خبر حضرات کو ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ''شعر العجم'' کے سلسلے میں جب حافظ محمود شیرانی نے تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور رسالۂ ''اردو'' دکن میں وہ مضامین شائع ہوئے تو دارالمصنفین اعظم گڈھ کے حامیوں میں سے بھی ایک بزرگ سے ایسی ہی غلطی سر زد ہوئی تھی۔ پروفیسر اقبال کے کسی مضمون کو علامہ مرحوم سے منسوب کیا گیا تھا۔

حضرت عیسیٰؑ فرمانے لگے ''دیکھو اس جانور کے کتنے خوبصورت سفید دانت ھیں !''

انسان کو چاھیے کہ تنقید میں انصاف سے کام لے ، اگر کسی شے کی برائی بیان کرے تو اس کے محاسن کا بھی ذکر کرے ، یہ نہ ھو کہ اپنے دوستوں اور متعلقین کے کارناموں کی تو تعریف کرے اور باقی تمام دوسرے لوگوں کے کاموں کو محض برا بھلا کہ کر ٹال دے ۔ نظم و نثر کے بارے میں یہ بات غلط ھوگی کہ انسان لفظوں کا اسیر ھو کر رہ جائے اور معانی سے یک لخت آنکھیں بند کرلے اور دل میں یہ خیال کرلے کہ اس لفظ کو پہلی مرتبہ فلاں آدمی نے اس طرح استعمال کیا ھے لہذا آئندہ کسی کو اظہار کے لیے اس لفظ کو کسی اور طرح استعمال کی اجازت نہیں ۔ ساتھ ھی یہ بھی نہیں ھونا چاھیے کہ ایران کے اکثر موجودہ نثر نگاروں اور شاعروں کی طرح لفظوں کی اھمیت کو اس طرح نظر انداز کردیا جائے کہ پڑھنے اور سننے والوں کے لیے مفہوم مبہم اور بے معنی ھو کر رہ جائے ۔

جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ھے ، میں سمجھتا ھوں کہ آقای داعی الاسلام نے انصاف اور اعتدال کو ملحوظ رکھا ھے ۔ اقبال کی شاعری کا سب سے اھم پہلو اس کے معانی اور مطالب ھیں ۔ اس مختصر سی کتاب میں جو اقبال کو لوگوں سے روشناس کرانے کے لیے لکھی گئی ھے ، اس کے کچھ اشعار درج کیے گئے ھیں ۔ میں ضروری سمجھتا ھوں کہ آپ لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کراؤں کہ آٹھویں صدی ھجری کے بعد ھندوستان اور ایران کی فارسی زبان میں بالتدریج اختلاف پیدا ھوتا چلا گیا ۔ دونوں ملکوں میں یہ زبان ایک خاص نہج پہ چلتی رھی اور ایک خاص طرح پر انقلاب پذیر ھوتی گئی ۔ پرانے زمانے میں فارسی میں جملوں کی بندش کے لیے کچھ ایسے اسلوب مروج تھے جو آج ایران میں

متروک ہو چکے ہیں لیکن ہندوستان میں بدستور رائج ہیں، مثلاً اقبال کا یہ مصرعہ

سر آمد روزگار ایں فقیری*

کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کی اس عبارت سے مشابہ ہے۔

''و آن لذتی حقیر چنیں غفلتی عظیم بدو راہ داد''

اور اسی سے ملتا جلتا فقرہ میں نے آقای ملک الشعرا بہار کے کسی شعر میں بھی دیکھا ہے۔ لیکن عام طور پر جب کسی کلمے کو یاے وحدت کے ساتھ ''آن'' یا'' این'' کے بعد لایا جاتا ہے تو اس کے بعد ایک جملۂ توصیفی کا آنا ضروری ہوتا ہے جسے لفظ ''کہ'' سے شروع کیا جاتا ہے۔ مثلاً

این فقیری کہ دست بجانب ما دراز کردہ است

جس طرح ہم عربی کے بہت سے الفاظ کو ان معنوں سے جو عربی میں متداول ہیں، مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور ترکی، فارسی اور عربی کے بہت سے الفاظ سے کوئی اور مفہوم لیتے ہیں، اسی طرح ہندوستان (اور افغان اور تاجیک) نے فارسی اور عربی کے کثیر الفاظ کے معانی کو بدل دیا ہے۔ اردو شاعری ہو یا فارسی وہ ایسے لفظ استعمال کرتے ہیں جن کی صورت تو فارسی یا عربی کی ہوتی ہے لیکن ان الفاظ کے مفہوم میں

---

* مصنف کتاب نے اس ''یا'' کو یائے موصولہ سمجھ کر اعتراض کیا ہے، اور لسانی اعتبار سے ایسا قیاس جائز بھی ہے۔ اس کا جواب خود انہوں نے کلیلہ دمنہ کے حوالہ سے دے دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ فارسی شاعری میں حروف زائدہ کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ انہیں حروف زائدہ محض صرف نحوی قیاس آرائیوں کے بل پر کیا جاتا ہے ورنہ شعر میں کوئی حرف زائد نہیں ہوتا بلکہ اس کی کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں یہ حروف زائدہ اور بالخصوص ''یا'' کا استعمال بہت زیادہ ہوا ہے، وہ زائد حرف بڑے بڑے لطیف معانی پیدا کرتے ہیں جو اس کے دقیق فکر کی ترجمانی کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس طرح سے عبارت کا اختصار بھی قائم رہتا ہے اور لفظوں کی معنویت میں وسعت بھی پیدا ہوتی ہے۔ فقیری کی ''یا'' ایسی ہی ہے۔ میں اسے یای تصغیر و تحقیر سے تعبیر کرتا ہوں یعنی فقیر حقیر۔ (مترجم)

ان کے اور ہمارے درمیان فرق ہوتا ہے ۔ اس طرح کا فرق کبھی کبھی ان تحریروں اور شعروں میں بھی دیکھا جاتا ہے جو سر زمین ایران کے مختلف گوشوں میں لکھے جاتے ہیں ۔ چنانچہ غزنوی اور سلجوقی عہد میں جو کتاب قُم میں تصنیف کی جاتی یا جو شعر اصفہان میں کہا جاتا اس شعر سے جو طوس میں کہا جاتا یا اس کتاب سے جو ہرات میں لکھی جاتی ، الفاظ اور ان کے معانی کے اعتبار سے مختلف ہوتی تھی ۔ ہندوستان ، افغانستان اور تاجیکستان میں بالخصوص گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں یہ باہمی تفاوت رفتہ رفتہ زیادہ نمایاں ہو گیا ہے ۔ یہاں تک کہ بعض الفاظ جو آج ایران میں عامیانہ حیثیت رکھتے ہیں اور شعر میں مستعمل نہیں ، ہندوستان میں فصیح اور ادبی الفاظ سمجھے جاتے ہیں ۔

علاوہ بریں علامہ اقبال کو کبھی کبھی اظہار خیال کی خاطر ایسے الفاظ کی ضرورت پڑی* جو یا تو فارسی زبان میں سرے سے تھے ہی نہیں یا اسے نہیں مل سکے ۔ اس لیے انہوں نے فارسی کے معمولی اور متداول الفاظ کو لیا اور انہیں مجازی اور وسیع تر معنے دے کر استعمال کیا ۔ ان میں سے ایک لفظ خودی ہے جس کے معنی اور مفہوم کے بارے میں ہم آئندہ اوراق میں بحث کریں گے ۔

بہر حال اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ علامہ کی زبان اردو تھی اور انہوں نے پنجاب میں نشو و نما پائی تھی اور ایسے اساتذہ سے

---

* ہر بڑے شاعر کو ایسی ضرورت پیش آیا کرتی ہے ۔ الفاظ کی معنوی وسعت شعر ہی میں آ کر کھلتی ہے ۔ دراصل الفاظ بذات خود چند حروف کے مرکبات کے سوا کچھ نہیں ہوتے ۔ شاعرانہ تصورات ان میں حسب ضرورت معنی پیدا کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن انہیں قبول کرتے ہیں ۔ جب کوئی لفظ اپنے شعری سیاق و سباق سے الگ ہوتا اور لغت کے سائے میں پناہ لیتا ہے تو پھر حرفی ڈھانچہ بن کے رہ جاتا ہے ۔ علامہ اقبال کو ایک مفکر ہونے کی حیثیت سے بہت سے الفاظ کو نئے معنی عطا کرنے پڑے تاکہ وہ انکے مفکرانہ اور فلسفیانہ تقاضوں کو پورا کرسکیں ۔ انہوں نے تقریباً تمام پرانے اشارات ، علامات یہاں تک کہ اصطلاحات اور تلمیحات کو بھی معنوی طور پر بدل دیا ۔ (مترجم)

فارسی پڑھی تھی جن کی مادری زبان فارسی نہیں تھی - وہ ہندوستان اور ایران کے قدیم نثر نگاروں اور شاعروں کی تصنیفات اور اشعار کے ذریعے فارسی زبان سے روشناس ہوئے تھے - انھیں کبھی ایران جانے کا اتفاق نہیں ہؤا تھا اور شاید انھیں اس مواد کو دیکھنے یا پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملا جو ان کے عہد میں ایران میں لکھا گیا اور شائع ہوا * - لیکن چونکہ وہ ایک بڑے قادر الکلام شاعر تھے اس لیے انھیں اس بات کا حق پہنچتا تھا کہ ان الفاظ میں جو وہ اظہار خیال کے لیے استعمال کرتے ہیں تصرفات سے کام لیں - بجائے اس کے کہ ہم ان کے الفاظ و تعبیرات پر نکتہ چینی اور لے دے کریں ہمیں چاہیے کہ ہم ممنون ہوں کہ اس جلیل القدر شاعر نے کہ جس کی مادری زبان اردو تھی ، فارسی زبان کو اپنے علمی اور فلسفیانہ اور شاعرانہ افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا - آپ کہیں گے بہت خوب ! لیکن آخر یہ اقبال تھا کون ؟ سنئے -

اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء مطابق ۲۴ ذوالحجہ ۱۲۸۹ھ قمری کو سیالکوٹ کے شہر میں جو پنجاب میں دریائے چناب کے قریب واقع ہے ، پیدا ہوئے - ان کے آبا و اجداد کشمیری برہمن تھے - دو صدی سے کچھ زیادہ عرصہ پہلے وہ مسلمان ہو گئے تھے - کہا جاتا ہے کہ ان کے والد بزرگوار شیخ نور محمد اکثر کشمیریوں کی طرح درویش مشرب تھے - علامہ اقبال نے سن بلوغ تک پہنچنے پر دینی اور دنیوی علوم حاصل کر لیے اور اس کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں گورنمنٹ کالج میں تعلیم پانے لگے - ان کے اساتذہ میں مولانا (میر) حسن اور ڈاکٹر آرنلڈ کا نام لیا جاتا ہے - لاہور میں ان کی تعلیم کا مخصوص موضوع فلسفہ تھا - اس کالج سے فارغ التحصیل ہونے پر وہ یورپ چلے گئے † اور وہاں پہلے پہل کیمبرج میں پھر ہائڈلبرگ اور مونیخ

---

* نئے ایرانی شعراء کا کلام ان کی نظر سے گذرا تھا ، بلکہ وہ ان کے عروضی اجتہادات سے متاثر بھی ہوئے تھے - پیام مشرق کی بعض نظمیں اسی تاثر کا نتیجہ تھیں - (مترجم)

† لندن جانے سے پہلے وہ گورنمنٹ کالج ہی میں کچھ عرصہ فلسفے اور انگریزی کے معلم بھی رہے - (مترجم)

کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی - اور مشرق اور مغرب کے فلسفہ و حکمت کی تکمیل کی اور انگریزی زبان میں ''ایران میں علم ما بعد الطبیعات کی ترقی'' کے موضوع پر کتاب لکھی جو چھپ چکی ہے† - یہاں وہ جن یورپین فلسفیوں، شاعروں اور مصنفوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں سے اوگست کانٹ - شو پنہاور - نیٹشے - ہیگل - آئنسٹائن - گوئٹے - اور ٹالسٹائی کے نام لیے جا سکتے ہیں‡ ، جن سے انھیں شدید اختلاف بھی تھا اور انھوں نے ان کے خیالات کی پر زور تنقید بھی کی - اقبال طبعاً شاعر تھے اور ان کی تربیت فلسفہ و حکمت کے آغوش میں ہوئی تھی - اس لیے ایرانی شعراء میں جو لوگ ان کے ہم خیال اور ہم ذوق تھے ، ان سے انھیں شغف رہا ، جن میں مولانا روم کا خصوصیت سے تتبع بھی کیا - ان کے متعلق وہ کہتے ہیں :

مثنوئ مولوئ معنوی هست قرآن در زبان پہلوی

یورپ سے فارغ التحصیل ہونے پر وہ پنجاب لوٹ آئے اور یہاں آ کر نثر و نظم کے ذریعے اپنے ہموطنوں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو درس بیداری دینا شروع کیا اور کوشش کی کہ تمام مسلمانان عالم کو عمل کی تلقین کریں اور انھیں ایک دوسرے سے متحد کر دیں اور ساتھ ہی ان کی زندگی اور تمدن کو بلند تر بنا دیں - انھوں نے شروع شروع میں اردو زبان میں شعر کہے اور مقالے لکھے - لیکن چونکہ فارسی زبان سے خاص مزاولت تھی اس لیے اسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیا اور اردو کو اپنے مطالب کی تفہیم کے لیے ناکافی سمجھنے لگے - وہ چاہتے تھے کہ ان کے خیالات کو تمام ''عجم'' یعنی ہندوستان ، افغانستان ، ایران ، تاجیکستان اور ترکی کے مسلمان پڑھیں اور سمجھیں - فارسی زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی اس لیے فارسی

† یہ کتاب پی ایچ ڈی کی ڈگری کے سلسلے میں پیش کی گئی تھی - (مترجم)

‡ فاضل مصنف نے یونہی بہت سے نام لکھ دیے ہیں - علامہ نے فلسفے کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ان سب کا مطالعہ کیا تھا لیکن برگساں ، نیٹشے اور گوئٹے کا انداز فکر انھیں مرغوب تھا - (مترجم)

ھی کو شعر کے لیے آلۂ کار بنایا ۔ اور اردو کو ترک کر دیا ۔ البتہ آخری عمر میں اپنے بعض دوستوں کے اصرار پر کچھ اردو اشعار بھی کہے ۔ ان کے فارسی اشعار کے ، جن میں قطعہ ، دوبیتی ، رباعی ، غزل ، مثنوی اور قصیدہ شامل ھیں ، حسب ذیل مجموعے ھیں :-

اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں
رموز بیخودی ۱۹۱۶ء میں
پیام مشرق ۱۹۲۳ء
زبور عجم بضمیمہ گلشن راز جدید
جاوید نامہ ۱۹۳۲ء
مسافر بضمیمہ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ۱۹۳۴ء

۱۹۲۴ء میں ان کے اردو اشعار کا مجموعہ شائع ھؤا جس کا نام بانگ درا ھے ۔ اس مجموعے میں ان کے وہ اشعار شامل ھیں جو انھوں نے یورپ جانے سے پہلے ' یورپ کی اقامت (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء) اور پھر پنجاب میں آنے کے بعد کہے تھے ۔ جب انھوں نے دوبارہ اردو کے شعر کہنے شروع کیے تو پھر دو کتابیں شائع کیں ایک کا نام ''بال جبرئیل'' ھے اور دوسری کا ''ضرب کلیم''۔ تیسرا مجموعہ ''ارمغان حجاز'' ان کی وفات کے بعد شائع ھؤا جسمیں ایک چوتھائی اردو اشعار ھیں اور باقی فارسی ۔

ان کتابوں میں سے اسرار خودی انگریزی میں ترجمہ ھو چکی ھے ۔ اس کے مترجم مرحوم پروفیسر نکلسن ھیں جنھوں نے مثنوی مولانا روم کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ھے ۔ نثر میں ایرانی علم ما بعد الطبیعات کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب انگریزی میں ھے جس کا نام ''تجدید بنائے الہیات اسلامیہ*'' ھے ۔ علاوہ بریں ان کے کچھ اور بھی مضامین

* Reconstruction of Islamic Thought شروع میں یہ علامہ مرحوم کے ان چھ مقالوں پر مشتمل تھی جو انہوں نے ۱۹۲۸ء میں مدراس میں پڑھے تھے ۔ بعد میں ایک اور مقالے کے اضافے کے ساتھ (Is Religion Possible?) جو لندن میں پڑھا گیا اس نام سے شائع ھوئی ۔ علامہ اقبال اسے ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' کہتے تھے ۔ (مترجم)

اور مقالے ہیں جو انگریزی یا اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔

اقبال نے تریسٹھ سال کی عمر میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو (مطابق آخر فرور دین ماہ یا اول اردی بہشت ۱۳۱۷) دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے سے سولہ مہینے پہلے وفات پائی۔ ان کے بعد ایک انجمن ان کے نام پر قائم کی گئی جسمیں ہندو، مسلمان اور عیسائی سبھی شامل تھے اور ''کتاب خانۂ اقبال'' کے نام سے ایک لائبریری کی بھی بنیاد رکھی گئی جو پبلک لائبریری سے ملحق ہے۔

میں نے جب تک علامہ محمد اقبال کی تصنیفات و تالیفات کا مطالعہ نہیں کیا تھا، مجھے معلوم نہ تھا کہ مسلمانان ہند ان کے بارے میں اس قدر غلو کیوں کرتے ہیں۔ اب جب کہ مجھے ان کے کلام سے آشنا ہونے کا موقع ملا ہے، مجھے ان کی عقیدت کی صحیح وجہ معلوم ہوگئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس عقیدت میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ یہ عقیدت بالکل بجا ہے۔ علامہ ایک قادر الکلام شاعر اور بلند فکر فلسفی تھے۔ ان کے کلام میں مستعدی، جوش اور زندگی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ یہ بات دوسروں میں بھی پیدا ہو اور دوسرے لوگ زندگی کے حقیقی معنوں سے آشنا ہوجائیں۔ ان کے کلام میں اس قدر تاثیر و قوت ہے کہ رسالت کا دعویٰ کیے بغیر آج لاکھوں نفوس انھیں نبی تو نہیں مانتے لیکن ان کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جیسے کسی نبی یا پیغمبر کے پیرو کیا کرتے ہیں۔ آج اہل ہند میں آزادی کا ذوق و شوق اور مسلمانان ہند میں ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کا جذبہ زیادہ تر علامہ موصوف ہی کی سیاسی تعلیمات کا مرہون منت ہے۔ جب ہم ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو ایران میں گزشتہ ایک سو سال کے اندر ہمیں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جسے بحیثیت مجموعی علامہ اقبال کا مقابل کہا جاسکے۔ ممکن ہے دوسرے مشرقی ممالک کا بھی یہی عالم ہو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبال فقط ایک شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک

ایسے شاعر تھے جنھوں نے اپنے عہد کے مروجہ علوم و فنون میں مہارت پیدا کی۔ وہ اپنی زبان میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے اور وہ انگریزی زبان میں بھی علمی اور فلسفیانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا پیشہ وکالت تھا وہ اجتماعی اور سیاسی معاملات میں بھی شریک ہوتے تھے اور انھوں نے ایک فلسفیانہ نظام یا طریق زندگی کی بھی بنیاد رکھی تھی جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتے تھے اور اس ضمن میں ان کے بہت سے پیروکار بھی پیدا ہوچکے تھے۔ علامہ موصوف کی زندگی، ان کی تصنیفات، عقاید و تعلیمات پر بعض کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں سے پانچ سات میں نے دیکھی اور پڑھی ہیں، یقیناً اتنی ہی اردو میں بھی لکھی گئی ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ علامہ اقبال کا بیشتر کلام فارسی میں ہے۔ اور اس بنا پر کبھی کبھی ان کے ہموطن اس سے گلہ اور شکایت بھی رکھتے تھے لیکن انھوں نے اس اعتراض کا جواب بھی دیا ہے۔ ان سے پہلے غالب کشمیری* نے کہا تھا کہ میرا اردو کلام میرا بیرنگ کلام ہے، میرے اشعار کے نقش ہای رنگ رنگ دیکھنے ہوں تو فارسی میں دیکھئے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

اور اقبال فرماتے ہیں :-

---

* غالب کے متعلق آن کے بعض مخالف معاصرین نے یہ بات مشہور کردی تھی کہ وہ کسی کشمیری کا بیٹا ہے اور ان کی سرخی مائل گوری سفید رنگت سے کچھ لوگ اس بات کو ماننے پر بھی مائل ہوگئے تھے۔ لیکن یہ امر حقیقت حال کے خلاف ہے۔ معلوم نہیں کہ آقای مجتبیٰ مینوی کا یہ بیان ان افواہوں پر مبنی ہے یا انہیں فقط اشتباہ ہؤا ہے۔ (مترجم)

هندیم از فارسی بیگانه ام   ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام

گرچہ ہندی در عذوبت شکّراست   طرز گفتار دری شیریں تراست

فکر من از جلوہ اش مسحور گشت   خامۂ من شاخِ نخل طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام   در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

لیکن آن کے نزدیک شاعری ایک نصب العین کے حصول کا ذریعہ تھی - یہ نصب العین کیا تھا ؟ لوگوں کو اکسانا اور انھیں ایک بنیادی نظام فکر کے ماتحت متحد کرنا تھا -

نغمہ کجا و من کجا ؟ ساز سخن بہانہ ایست

سوی قطار می کشم ناقۂ بی زمام را

شروع شروع میں وہ اس کام میں مصروف رہے کہ ہندوستانیوں کو بیدار کیا جائے اور انھیں نعمت آزادی کے حصول کی ترغیب دلائی جائے تاکہ وہ اطاعت و غلامی کے جوئے کو اتار کر پھینک دیں - لیکن رفتہ رفتہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد ممکن نہیں - دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلمانان ہند کی ایک کنفرنس میں انھوں نے صدارت فرمائی اور انگریزی میں ایک خطبہ پڑھا جو چھپ چکا ہے - اس خطبے کا خلاصہ یہ تھا کہ آن تمام الگ الگ قوموں کو جو مسلمان ہو چکی ہیں ، اپنی اپنی قومیت کے خیال کو دور کر دینا چاہیے اور پھر وحدت دینی پر اپنے اتحاد کی بنیاد رکھنی چاہیے - ہندوستان میں ہند و مسلم اتحاد کی کوئی امید باقی نہیں اس لیے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے ، مسلم اور ہندو - یہ علامہ مرحوم کا بنیادی سیاسی عقیدہ تھا - اور اسی عقیدے کے باعث وہ اپنی تمام شاعرانہ شکایتوں ، فریادوں اور دعوتوں میں جمیع مسلمانان عالم سے خطاب

کرتے رہے اور آن کا مطمع نظر ان مسلمانوں کے حالات سنوارنا اور انھیں اهل یورپ کے ظلم و تعدی سے نجات دلانا تھا۔ نظم ''ساقی نامہ'' میں جو ''نشاط باغ کشمیر'' میں لکھی گئی تھی ، وہ فرماتے ھیں :-

نبینی که از کاشغر تا به کاشان | همان یک نوا بالا از هر دیاری
ز چشم امم ریخت آن اشک نابی | که تاثیر او گل دماند ز خاری

اور وہ اس نظم میں ساقی سے یہ آرزو رکھتے ھیں کہ اس بادۂ جاں فروز کا ایک قطرہ مرد کشیری (یعنی کشمیری) پر گرے۔

کشیری که با بندگی خو گرفته | بتی می تراشد ز سنگ مزاری
ضمیرش تهی از خیال بلندی | خودی ناشناسی، زخود شرمساری
بریشم قبا خواجه از محنت او | نصیب تنش جامهٔ تار تاری
نه در دیدهٔ او ، فروغ نگاهی | نه درسینهٔ او ، دل بیقراری
از آن می فشان قطرهٔ بر کشیری | که خاکسترش آفریند شراری

یعنی فینکس* پرندے کی طرح کشمیری بھی اپنے آبا و اجداد کی خاکستر سے ابھرے گا اور چونکہ سرزمین کشمیر علامہ مرحوم کے آبا و اجداد کا وطن تھی اور اس سے انھیں لگاؤ تھا ، وہ اس سرزمین کے حسن و جمال اور یہاں کے رھنے والوں کی حالت زار کا ذکر بھی کرتے ھیں۔ اسی نظم میں لکھتے ھیں :

چه شیرین نوای چه دلکش صدای | که می آید از خلوت شاخساری
بتن جان ، بجان آرزو زنده گردد | ز آوای ساری ، ز بانگ هزاری
نواهای مرغ بلند آشیانی | در آمیخت بانغمهٔ جوئیباری
تو گوئی که یزدان بهشت برین را | نهادست در دامن کوه ساری
که تا رحمتش آدمی زادگان را | رها سازد از محنت انتظاری
چه خواهم درین گلستان گرنخواهم | شرابی ، کتابی ، ربابی ، نگاری

۱- (ققنس) Phoenix

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بین ، لالہ چمن چمن نگر

باد بہار موج موج ، مرغ بہار فوج فوج
سلسل و سار زوج زوج ، بر سر نارون نگر

زخمہ بتار ساز زن ، بادہ بساتگین بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

دخترکی برہمنی ، لالہ رخی ، سمن بری
چشم بروی اُو کشا ، باز بہ خویشتن نگر

انہی اشعار میں جہاں وہ خطۂ کشمیر کے حال زار پہ روتے ہیں ، وہ اس امید کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اس سرزمین کے رہنے والے کسی نہ کسی دن سر بلند ہوں گے - وہ جنیوا کی مجلس اقوام سے شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آؤ اور اس قوم کی داد رسی کرو :-

جان ز اہل خطہ سوزد چون سپند
خیزد از دل نالہ های درد مند

زیرک و درّاک و خوشگل ملّتی است
در جہان تر دستیِ آو آیتی است

شاعرش غلطندہ اندر خونِ آوست
در نیٔ من نالہ از مضمونِ اوست

از خودی تا بی نصیب افتادہ است
در دیارِ خود غریب افتادہ است

دست مزد آو بدست دیگران
ماہیِ رودش بہ شست دیگران

کاروان ها سوی منزل گام گام
کار او نا خوب و بی اندام و خام

ناله پنداری که بودست این چنین
جبه را همواره سود است این چنین

در زمانی صف شکن هم بوده است
چیره و جان باز و پر دم بوده است

کوه های خنک سار او نگر
آتشین دست چنار او نگر

کوه و دریا و غروب آفتاب
من خدا دیدم در آنجا بی حجاب

با نسیم آواره بودم در نشاط
" بشنو از نی " می سرودم در نشاط

مرغکی می گفت اندر شاخسار
با پشیزی می نیرزد این بهار

نالهٔ پر سوز آن مرغ سحر
داد جانم را تب و تاب دگر

تا یکی دیوانه دیدم در خروش
آنکه برد از من متاع صبر و هوش

بگذر ز ما و نالهٔ مستانه ای مجوی
بگذر ز شاخ گل که طلسمی است رنگ و بوی

گفتی که شبنم از ورق لاله می چکد
غافل دلی است این که بگرید کنار جوی

باد صبا اگر به جنیوا گذر کنی
حرفی زما به مجلس اقوام باز گوی
دهقان و کشت و جوی و خیابان فروختند
قومی فروختند و چه ارزان فروختند

اس کے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھتے ھیں اور ھندوستان کے بارے میں شکایتاً کہتے ھیں :-

شبی به میکده خوش گفت پیر زنده دلی
بهر زمانه خلیل است و آتش نمرود
چه نقشها که نبستم بکارگاه حیات
چه رفتنی که نرفت و چه بودنی که نبود
بخاکِ هند نوای حیات بی اثر است
که مرده زنده نه گردد ز نغمهٔ داؤد

لیکن ان مایوس کن حالات کے باوجود بے کار نہیں بیٹھنا چاھیے -

بخواب رفته جوانان و مرده دل پیران
نصیب سینهٔ کس آه صبحگاهی نیست
باین بهانه بدشت طلب ز پا منشین
که در زمانهٔ ما آشنای راهی* نیست
بیا که دامن اقبال را بدست آریم
که آو ز خرقه فروشان خانقاهی نیست

فلک زحل کی سیاحت کے ضمن میں وہ ایسی ارواح رذیلہ کو دیکھتے ھیں جنھوں نے ملک و ملت کے ساتھ غداری کی ھے اور دوزخ نے انھیں قبول نہیں کیا ، انھی میں سے ایک میر جعفر بنگالی ھیں جنھوں نے نواب سراج الدولہ سے بے وفائی کی اور دوسرے صادق دکنی ھیں جنھوں

* یعنی باین بہانه که دراین زمان راهنمای نیست نباید از طلب فرونشست (مصنف)
معلوم ھوتا ھے مصنف کو بظاھر اس شعر کی بندش میں کچھ اجنبیت نظر آتی تھی اس لیے اس نے اس کی نثری صورت بیان کردی ھے - (مترجم)

نے ٹیپو سلطان سے غداری کی تھی اور یہ انہی کے اعمال بد کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان غلام بن کر رہ گیا ۔ اس سلسلے میں فرماتے ھیں :۔

می ندانی خطۂ ہندوستان — آن عزیز خاطرِ صاحب دلان

خطه ای هر جلوه اش گیتی فروز — درمیان خاک و خون غلطد هنوز

درگلش تخم غلامی را که کشت

این همه کردار آن ارواح زشت

روح ہندوستان فریاد کرتی ھے کہ :۔

شمع جان افسرد در فانوس هند — هندیان بیگانه از فانوس هند

مردک نا محرم از اسرار خویش — زخمهٔ خود کم زند بر تار خویش

بر زمان رفته می بندد نظر — زآتش افسرده می سوزد جگر

بند ها بردست و پای من ازوست — ناله های نا رسای من ازوست

خویشتن را از خودی پرداخته — از رسوم کهنه زندان ساخته

آدمیت از وجودش درد مند — عصرنو از پاک و ناپاکش نژند

کی شب هندوستان آید بروز

مُرد جعفر ، روحِ او زنده هنوز

یہ گردش بالتدریج شاعر کو کشمیر اور ہندوستان کی محبت سے اتحاد اسلام کے مرحلے پر پہنچاتی ھے ۔ وہ چاھتا ھے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک کے رھنے والے مسلمان ایک دوسرے سے مل جائیں اور مل کر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کریں ، ملک و نسل کے امتیاز کو مٹا دیں اور توحید و نبوت کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں ، کیونکہ دین سب سے بڑا وطن ھے اور ملیت آب و خاک سے وابستہ نہیں ہوتی ۔

عجم هنوز نداند رسوم دین ورنه

ز دیوبند حسین احمد ، این چه بوالعجبی است

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بی خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برسان خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بو لہبی است

آن کا ایک اردو کا شعر ہے :-

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہان ہمارا

اس شعر نے اب ہندی مسلمانوں میں ترانہ ملی کی حیثیت اختیار کرلی ہے ۔ اس موضوع پر ہم بعد میں مزید بحث کریں گے ۔

اقبال اپنے آپ کو ایک فارسی گو ہندی مسلمان سمجھتے ہیں :-

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

اگرچہ زادۂ ہندم فروغ چشم من است
ز خاک پاک بخارا و کابل و تبریز

وہ شعر اپنے عہد و زمانہ کے رجحان کے مطابق کہتے ہیں :-

من بہ طبع عصر خود گفتم دو حرف — کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرف پیچا پیچ و حرف نیش دار — تا کنم عقل و دل مردان شکار
تا مزاج عصر من دیگر فتاد — طبع من ہنگامۂ دیگر نہاد

اگر آج لوگ اُن کے کلام کو نہیں سمجھتے تو کل سمجھیں گے :-

انتظار صبح خیزان می کشم — ای خوشا زرتشتیان آتشم
عصر من دانندۂ اسرار نیست — یوسف من بہر این بازار نیست
نا امیدستم ز یارانِ قدیم — طور می سوزد کہ می آید کلیم

پس از من شعر من خوانند و دریا بند و می گویند
"جہانی را دگر گون کرد یک مردِ خود آگاهی"

نغمه‌ام از زخمه بی پرواستم من نوای شاعر فرداستم

اُن کا مخاطب عجم ہے ، یعنی غیر عرب کی تمام مسلمان قومیں ، خواہ وہ فارسی بولتی ہوں یا اردو یا ترکی ۔

چون چراغ لاله سوزم در خیابان شما
ای جوانان عجم جان من و جان شما
غوطه ها زد در ضمیر زندگی اندیشه ام
تا بدست آورده ام افکار پنهان شما
فکر رنگینم کند نذر تهی دستان شرق
پارهٔ لعلی که دارم از بدخشان شما
می رسد مردی که زنجیر غلامان بشکند
دیده ام از روزن دیوار زندان شما
حلقه گرد من زنید ای پیکرانِ آب و گل
آتشی در سینه دارم از نیاگان شما

انھوں نے اپنے کلام کے نغموں سے سارے عجم کو اسیر بنا لیا ہے اور ان لوگوں کے باھمی افتراق و تشتت کو اتحاد و یگانگت میں تبدیل کردیا ہے :۔

عجم از نغمه های من جوان شد ز سودایم متاع او گران شد
هجومی بود ره گم کرده در دشت ز آواز درایم کاروان شد

عجم از نغمه ام آتش بجان است صدای من درای کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی که ره خوابیده و محمل گران است

لیکن تعجب یہ ہے کہ اقوام عرب نے ابھی اس کی آواز نہیں سنی :-

نوای من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بی خبر است

انھوں نے شعر کو لوگوں کی رہنمائی کا وسیلہ بنایا ہے اور وہ جس عشق و شوق کا اظہار کرتے ہیں وہی قدیم عشق و شوق ہے لیکن اس کا انداز تازہ ہے :-

دلیل منزل شوقم بدامنم آویز شرر ز آتش نایم بخاک خویش آمیز
عروس لالہ بروں آمد از سراپۂ ناز بیا کہ جان توسوزم زحرف شوق انگیز
بہر زمانہ باسلوب تازہ میگویند حکایت غم فرہاد و عشرتِ پرویز

شعر اثر و سوز کا نام ہے اور شاعر کا مقصد حکمت کی نشر و اشاعت اور آدم گری ہے مولانا روم کے قول کا ذکر کرتے ہیں :-

گفت آن شعری کہ آتش اندر اوست
اصل او از گرمی اللہ ہوست

آن نوا گلشن کند خاشاک را
آن نوا برہم زند افلاک را

ای بسا شاعر کہ از سحر ہنر
رہزن قلب است و ابلیس نظر

زان نوای خوش کہ نشناسد مقام
خوشتر آں حرفی کہ گوئی در منام

فطرت شاعر سراپا جستجوست
خالق و پروردگار آرزو ست

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملتی بی شاعری انبار گل

سوز و مستی نقشبند عالمی است
شاعری بی سوز و مستی ماتمی است

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری هم وارث پیغمبری است

آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے جب وہ شاعر ہندی بھرتری ہری کو افلاک کے اس طرف پاتے ہیں تو اس سے شعر اور شعر کے سوز کے متعلق سوال کرتے ہیں :-

ای که گفتی نکته های دل نواز — مشرق از گفتار تو دانای راز
شعر را سوز از کجا آید ، بگوی — از خودی یا از خدا آید ، بگوی

اور بھرتری ہری جواب دیتے ہیں :-

کس نداند درجهان شاعر کجاست — پردهٔ او از بم و زیر نواست
آن دل گرمی که دارد در کنار — پیش یزدان هم نمی گیرد قرار
جان مارا لذت اندر جستجوست — شعر را سوز از مقام آرزوست
ای تو از تاک سخن مست مدام — گر ترا آید میسر این مقام

با دو بیتی در جهان سنگ و خشت
میتواں بردن دل از حور بهشت

اقبال اپنے آپ کو صاحب درد شاعر سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کے دل میں بھی شوق و آرزو کا جوش و خروش پیدا ہو ۔ جو شاعر درد نہیں رکھتے اور دوسروں کے دکھ سے متاثر نہیں ہوتے ، اقبال اُن کے مخالف ہیں :-

از نوا برمن قیامت رفت و کس آگاه نیست
پیش محفل جز بم و زیر و مقام و راه نیست
در نهادم ، عشق با فکر بلند ، آمیختند
نا تمام جاودانم ، کارمن چو ماه نیست

جرہ شاہینی ، بمرغان سرا صحبت مکن
خیز و بال و پر کشا، پرواز تو کو تاہ نیست

کرم شب تاب است شاعر در شبستان وجود
در پر و بالش فروغی گاہ ہست و گاہ نیست

در غزل اقبال احوال خودی را فاش گفت
زانکہ این نو کافر از آئین دیر آگاہ نیست

آن کے مضمون دوسروں سے عاریتاً نہیں لیے گئے - جب کبھی کوئی تازہ مضمون آن کے خیال میں آتا ہے تو آن کا دل تڑپ اٹھتا ہے :-

خیالم کو گل از فردوس چیند — چو مضمون غریبی آفریند
دلم در سینہ می لرزد چو برگی — کہ بروے قطرۂ شبنم نشیند

وہ کبھی کبھی شعراء قدیم کے کسی مضمون کو لے کر اس میں تصرف کو کام میں لاتے ہیں اور اس سے ایک نیا اور تازہ شعر وجود میں آتا ہے - ذیل کی حکایت کی طرح کہ فی الاصل سعدی کی ہے اور ناظرین اس سے آشنا ہیں :-

مرا معنی تازہ ای مدعاست — اگر گفتہ را باز گویم رواست
''یکی قطرہ باراں زابری چکید — خجل شد چو پہنا ی دریا بدید
کہ جای کہ دریاست من کیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم''
ولیکن زدریا بر آمد خروش — ز شرم تنک مایگی رو مپوش
تماشای شام و سحر دیدہ ای — چمن دیدہ ای، دشت و در دیدہ ای
زموج سبک سیر من زادہ ای — ز من زادہ ای در من افتادہ ای
بیاسای در خلوت سینہ ام — چو جوہر درخشش اندر آئینہ ام

گہر شو درآغوش قلزم بزی
فروزاں تر از ماہ و انجم بزی

وہ قدیم شعراء بالخصوص صوفیاء کے ، جنھوں نے ترک دنیا کیا اور اپنے نفس کو مارا ، مخالف تھے - '' اسرار خودی '' میں پیغمبر گوسفنداں کے قول

کے سلسلے میں اس شعر کو نقل کرتے ھیں جو صوفیاء کے عقیدے کا آئینہ دار ھے :-

چشم بند و گوش بند و لب بند
تا رسد فکر تو بر چرخ بلند

اقبال فرماتے ھیں :

چشم و گوش ولب کشا ای ھوشمند
گر نبینی راہ حق ، بر من بخند

مولوی رومی کا ایک شعر ھے جس کا اطلاق یہاں صحیح طور پر ھوتا ھے ۔ ایک زاھد گناہ نصوح سے آگاہ ھے لیکن وہ اس کے راز کو فاش نہیں کرتا ۔ صوفیاء اس شعر کو لے کر اپنی خاموشی کو جو غالباً جہل کا نتیجہ ھے ، حسب ذیل شعر کی صورت میں بطور مقولے کے پیش کرتے ھیں :-

ھر کرا اسرار کار آموختند
مہر کردند و دھانش دوختند

لیکن اقبال فرماتے ھیں کہ جب کسی کو آگاھی کا نور حاصل ھو تو اسے چاھیے کہ اسے ھویدا کردے :-

تا مرا رمز حیات آموختند　　آتشی در پیکرم افروختند
یک نوای سینہ تاب آوردہ ام　　عشق را عہد شباب آوردہ ام

وہ مشرقی تصوف اور قدیم عقلی فلسفہ جو حکمت افلاطون سے سیراب ھؤا ھے ، دونوں کو تمدن کی تیز رفتاری سے پیچھے رہ جانے کا سبب سمجھتے ھیں اور کہتے ھیں کہ دنیا کو حقیر نہیں کہنا چاھیے بلکہ اسے اپنی ذات کی وسعت اور ارتقای نفس کا ذریعہ بنانا چاھیے :

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و تر　　تختۂ تعلیم ارباب نظر
ای کہ از تاثیر افیون خفتہ ای　　عالم اسباب را دون گفتہ ای
خیز و وا کن دیدۂ مخمور را　　دون مخوان این عالم مجبور را

غایتش توسیع ذات مسلم است　　استحان و ممکنات مسلم است
گیر او را تا نه او گیرد ترا　　همچو می اندر سبو گیرد ترا
تا ز تسخیر قوای این نظام　　ذو فنونیهای تو گردد تمام
تائب حق در جهان آدم شود　　بر عناصر حکم او محکم شود

یہاں تک کہ موت کی آرزو کرنا اور اس دنیا کی زندگی سے دل آٹھالینا بھی جائز نہیں :-

سخن از بود و نابود جہاں با من چہ میگوئی
من این دانم کہ من ہستم ندانم این چہ نیرنگ است
کہن شاخی کہ زیر سایہ او پر بر آوردی
چو برگش ریخت از وی آشیان برداشتن ننگ است

ایران * کے تمام شاعروں میں سے آنھوں نے ایک اپنا آستاد اور مرشد انتخاب کر لیا ہے اور وہ مولانا روم ہیں :-

پیر رومی خاک را اکسیر کرد　　از غبارم جلوہ ها تعمیر کرد
ذرہ از خاک بیابان رخت بست　　تا شعاع آفتاب آرد بدست

---

* مولانا روم بلخ میں پیدا ہوئے اور روم یعنی ایشیائے کوچک کے شہر قونیہ میں زندگی گزاری اور وہیں آنکی شاعری کی نشوونما ہوئی - مولد و منشا کے اعتبار سے انہیں سر زمین ایران سے بالواسطہ نسبت تھی - اور وہ بھی بقول مرزا غالب ''واں کے نہیں تو واں سے نکالے ہوئے تو ہیں'' دور کی نسبت تھی - ابھی آن کا بچپن ہی تھا کہ آن کے والد بہاءالدین ولد کو علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے ملک سے بدر کردیا تھا - ان تمام حالات کے پیش نظر آنہیں رومی ہی کہنا درست ہے اور اسی نام سے وہ جائز طور پر مشہور بھی ہیں - لیکن جیسا کہ دستور ہے آن کی عظمت اور شہرت کے باعث ایران اور اہل ایران انہیں اپنی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ، بالخصوص جب کہ آن کی مثنوی کی زبان بھی فارسی ہے - یہی حال البیرونی اور جمال الدین افغانی کا ہے - یونان کے شاعر ہومر کی شہرت دوام کے باعث اب بہت سے شہر آن کے مدفن ہونے کے مدعی ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ انہی شہروں میں ، جب وہ زندہ تھا تو نان شبینہ کو ترستا تھا - (مترجم)

موجم و در بحر او منزل کنم　　تا در تابنده ای حامل کنم
من که مستیها ز صهبایش کنم　　زندگانی از نفسهایش کنم

اور پھر کہتے ھیں : ۔

روی خود بنمود پیر حق سرشت　　کو بحرف پہلوی قرآن نوشت
گفت ' ای دیوانۂ ارباب عشق　　جرعه ای گیر از شراب ناب عشق'

وہ اس بات پر فخر کرتے ھیں کہ وہ رموز مولوی روم سے آشنا ھیں : ۔

مرا بنگر که در هندوستان دیگر نمی بینی
برهمن زاده ای رمز آشنای روم و تبریزاست
بیا که من ز خم پیر روم آوردم
می سخن که جوان تر ز بادۂ عنبی است

ایک جگہ وہ مولانا روم کے ایک قول کو نقل کرتے ہوئے آن کا ذکر یوں کرتے ھیں : ۔

مرشد رومی حکیم پاک زاد　　ستر مرگ و زندگی برما کشاد
هر هلاک اُمت پیشین که بود　　زان که صندل را گمان بر دند عود

ایک اور مقام پر حکمت و شعر کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ھیں : ۔

بو علی اندر غبار ناقه گم　　دست رومی پردۂ محمل گرفت
این فروتر رفت تا گوهر رسید　　آن بگردابی چو خس منزل گرفت
حق اگر سوزی ندارد حکمت است　　شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

جاوید نامے میں جہاں وہ آسمانوں کی سیر کرتے ھیں اور ارواح رفتگاں کو دیکھتے ھیں، آن کے رھنما بھی ھر جگہ مولانا روم ھی ھیں ۔ کتاب کے آخیر میں وہ اپنے فرزند ' جاوید کو یوں خطاب کرتے ھیں : ۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکه رومی مغز را داند زپوست — پای او محکم فتد در کوی دوست
شرح او کردند و او را کس ندید — معنی او چون غزال از ما رمید
رقص تن از حرف او آموختند — چشم را از رقص جان بر دوختند
رقص تن در گردش آرد خاک را — رقص جان برهم زند افلاک را
علم و حکم از رقص جان آید بدست — هم زمین ، هم آسمان ، آید بدست

باوجود اس کے کہ علاّمہ موصوف صوفیاء کی طرز زندگی اور عمل کے مخالف تھے ، اُن کے بعض افکار اور اصول عقاید میں قدیم بزرگوں کے عرفان و تصوف کی چاشنی ہے - انھی میں سے ایک مسئلہ اصل وحدت وجود کا ہے کہ صوفیاء اُسے لفظ ''اتحاد'' سے تعبیر کرتے ہیں - مراد یہ ہے کہ دنیا و مافیہا میں جز خدا کچھ بھی نہیں - اس اعتبار سے ہر ایک خدا بھی ہے اور یہی وجہ تھی کہ حسین بن منصور حلاج نے اناالحق کہا تھا - اقبال کو بھی یہ اصول قبول ہے مگر اس میں یہ فرق ہے کہ صوفی کہتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو مٹادے اور خدا میں گم ہو جائے لیکن وہ فرماتے ہیں انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو پہچانے اور اپنی خودی پر غور و تعمق کرے اور اپنی ذات کی تربیت کرے اور اُسے وسعت دے کر اس قابل بنالے کہ زمین پر خدا کا نائب اور سایۂ خدا بن جائے اور خدا کو اپنے آپ میں جذب کر لے اور اس کے ساتھ ایک ہو جائے :-

کرا جوئی ؟ چرا در پیچ و تابی؟ — که اُو پیداست تو زیر نقابی
تلاش اُو کنی ، جز خود نبینی — تلاش خود کنی ، جز اُو نیابی

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

چنان باذات حق خلوت گزینی — ترا اُو بیند و اُو را تو بینی
بخود محکم گزار اندر حضورش — مشو نا پید اندر بحر نورش

اس موضوع پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ مختلف قوموں میں کوئی باھمی اختلاف نہیں، سب کی سب آدم کی اولاد ھیں:—

هنوز از بند آب و گل نرستی   تو گوی، رومی و افغانیم من
من اول آدم بی رنگ و بویم   از آن پس هندی و تورا نیم من

اور جو لوگ ان اختلافات کو پیدا کرتے ھیں وہ بت گر اور بت تراش ھیں، اور اس بت کے سامنے انسانیت کو قربان کرتے ھیں:

فکر انسان، بت‌پرستی، بتگری   هر زمان در جستوی پیکری
باز طرح آذری انداخت است   تازه تر پروردگاری ساخت است
کاید از خون ریختن اندر طرب   نام‌اور رنگ است‌و هم ملک و نسب
آدمیت کشته شد چون گوسفند   پیش پای این بت نا ارجمند
آن فلارنا وی* باطل پرست   سرمۀ او دیده مردم شکست
نسخۀ ای بہر شہنشاهان نوشت   در گل ما دانۀ پیکار کشت
بتگری مانند آذر پیشه اش   بست نقش تازه ای اندیشه اش
مملکت را دین او معبود ساخت   فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسه تابرپاے آن معبود زد   نقد حق را بر عیار سود زد

ہم نہیں چاہتے اس مرد فہیم اور شاعر قادرالکلام پر نکتہ چینی کریں لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ھیں کہ چونکہ ہمارا شاعر اپنے خیالات

---

* Niccolo (Machiavelli) فلارنس (اٹلی) کا ایک مشہور مدبر سیاست اور مؤرخ (۱۴۶۹ء - ۱۵۲۷ء) عرصے تک فلورنس کے جمہوریہ کی باگ ڈور اس کے ھاتھ میں رھی اور وہ حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک رھا۔ سیاست میں اس کے خاص نظریات تھے جو اس نے مشہور و معروف تصنیف "The Prince" میں لکھے ھیں۔ وہ سیاست و حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے تشدد کا بھی قائل تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر حکومت کے استحکام کے لیے دینی اور اخلاقی اقدار کو بھی قربان کرنا پڑے تو مضائقہ نہیں۔ یورپ میں مدت مدید تک اس کی تصنیف مقبول رھی اور اب بھی تاریخ سیاسیات میں اس کا خاص رتبہ ہے۔ (مترجم)

پر فریفتہ تھا اس نے یہ نہیں دیکھا کہ جو کچھ وہ ماکیا ولی اور دوسروں کے بارے میں کہتا ہے، خود اس پر بھی وارد ہوتا ہے*۔ اگر اُن لوگوں نے رنگ، نسل یا نسب یا ملک کو اپنا معبود بنایا ہے اور اس سلسلے میں جنگ اور خونریزی کو جائز سمجھتے ہیں تو اقبال بھی جیسا کہ ہم نے دیکھا اور آئندہ بھی دیکھیں گے، ملت یعنی دین اسلام کو اپنا معبود مانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پیروان دین باہم متحد ہوجائیں اور اپنے مخالفین کے ساتھ جنگ کریں۔ و کل حزب بما لدیھم فرحون۔ آگے چلیے۔ ایک اور بات، جہاں وہ صوفیا کی پیروی کرتے ہیں یہ ہے کہ انسان عشق سے ممتاز ہے اور عاشق کا مذہب کچھ بھی ہو، دوست تک پہنچتا ہے:-

دماغم کافر زنار دار است　　بتاں را بندہ و پروردگار است
دلم را بین کہ نالد ازغم عشق　　ترا بادین و آئینم چہ کار است
دی کافرکی دیدم در وادی بطحا مست
از حرف دلاویزش اسرار حرم پیدا

مرنج از برھمن ای واعظ شہر
گر آزما سجدہ ای پیش بتاں خواست
خدای ما کہ خود صورتگری کرد
بتی را سجدہ ای از قدسیاں خواست

---

* یہاں مجھے مصنف سے شدید اختلاف ہے۔ ماکیا ولی کی روح سیاست، اقبال کے سیاسی تصورات کی ضد ہے۔ اقبال سیاسیات کو دین اور اخلاق کے بلند اقدار کے تابع سمجھتا ہے بلکہ اُن کے استحکام کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی سیاسی نظریہ یا لائحہ عمل اُن کے منافی ہو تو غلط ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دین اور سیاست ایک ہیں:- "جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ پھر اقبال اس تشدد کا حامی بھی نہیں جس کا پرچار ماکیا ولی نے کیا ہے۔ (مترجم)

در عشق و هوسناکی دانی که تفاوت چیست
آن تیشهٔ فرهادی ، این حیلهٔ پرویزی

اس عشق کے مقابلے میں عقل و علم عاجز اور بیکار ہیں - جس طرح ابن سینا اور مولوی رومی کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا اسی طرح ان دو قطعوں میں علم و عشق کا مکالمہ ہے ، علم کہتا ہے مجھے مافوق الفطرت سے غرض نہیں ، میرا تعلق اس دنیا سے ہے اور بس :-

نگاهم رازدار هفت وچار است گرفتار کمندم روزگار است
جهان بینم باین سو باز کردند مرا باآن سوِ گردون چه کار است

چکد صد نغمه از سازی که دارم
ببازار افگنم رازی که دارم

اور عشق جواب میں کہتا ہے کہ علم اگر عشق کے ہمراہ نہ چلے تو گمراہ ہو جاتا ہے :-

ز افسون تو دریا شعله زار است هوا آتش گذار و زهردار است
چو بامن یار بودی نور بودی بریدی از من و نور تو نار است

بخلوت خانه لاهوت زادی
ولیکن در نخ شیطان فتادی

ان شعروں سے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ممکن ہے علم ابتدا میں انسان کی مدد کرے لیکن آخر کار منزل مقصود پر پہنچانے والا عشق ہی ہے :-

علم را مقصود اگر باشد نظر میشود هم باده و هم زاهبر
علم تفسیر جهان رنگ و بو دیده و دل پرورش گیرد ازو
بر مقام جذب و شوق آرد ترا باز چون جبریل بگذارد ترا
علم کس را کی به خلوت میبرد او زچشم خویش غیرت میبرد

اوّلِ اُو هم رفیق و هم طریق
آخرِ او راه رفتن بی رفیق

می نداند عشق سال و ماه را　　دیر و زود و نزد و دور راه را
عقل در گوهر شکافی میزند　　یا بگرد او طوافی میزند
کوه پیش عشق چون کاهی بود　　دل سریع السیر چون ماهی بود
عشق شبخونی زدن بر لا مکان　　گور را نادیده رفتن از جهان
عشق با نان‌جوین خیبر کشاد　　عشق در اندام مه چاکی نهاد
چون خودی را ازخداطالب شود　　جمله عالم مرکب، اورا کب شود

علم و عقل و خبر سے ظاہر کی تعمیر ہوتی ہے ۔ لیکن عشق ظاہر کو ویران کرتا ہے تا کہ باطن کو آباد کرے ، جسم کو تابع کرتا ہے تا کہ روح آزاد ہو :۔

ہر کہ پیمان با ہوا لموجود بست
گردنش از بند ہر معبود رست
مؤمن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکنِ ما ، ممکن است

عقل سفّاک است واوسفّاک تر　　پاک تر، چالاک تر، بے باک تر
عقل در پیچاک اسباب و علل　　عشق چوگان باز میدانِ عمل

عشق صید از زور بازو افگند　　عقل مکّاراست و دامی مینهد
عقل‌را سرمایه ازبیم و شک است　　عشق را عزم و یقین لاینفک است
آن کند تعمیر تا ویران کند　　این کند ویران کہ آبادان کند
عقل چون بادست، ارزان در جہان　　عشق کمیاب و بہای او گران
عقل محکم ازاساس چون و چند　　عشق عریان از لباس چون و چند
عقل میگوید کہ‌خود راپیش کن　　عشق گوید امتحان خویش کن
عقل گوید شاد شو ، آباد شو　　عشق گوید بندہ شو ، آزاد شو
عشق را آرام جان ، حریتست　　ناقہ اش را ساربان ، حریتست

سر زمین مغرب کے صاحب نظروں اور مشرق کے صاحبدلوں میں جو واضح فرق ہے وہ یہ ہے کہ مشرقی لوگ عشق و نظر* کو اہمیت دیتے ہیں اور اہل مغرب عقل و خبر† کی طرف مائل ہیں :-

نشان راہ زعقل ہزار حیلہ مپرس — بیا کہ عشق کمالی زیک فنی دارد
فرنگ گرچہ سخن باستارہ میگوید — حذر کہ شیوۂ او رنگ جوزنی دارد

مشرقیوں کے اس طریق کو مغربیوں کی روش پر ترجیح دیتے ہوئے وہ مولوی رومی کا قول پیش کرتے ہیں :-

شرق حق را دید و عالم را ندید — غرب درعالم خزید از حق رمید
چشم برحق باز کردن بندگی است — خویش را بی پردہ دیدن زندگی است

ترکی کے فاضل وزیر سعید حلیم پاشا کا قول یوں پیش کرتے ہیں :-

غربیان را زیرکی ساز حیات — شرقیان را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چون با زیرکی ہم بر شود — نقشبند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیزدہ

سرزمین مغرب کا بڑا عیب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ عشق وقلب وایمان کے معاملات کو یکسر مہمل سمجھتے ہیں :-

دل بیدار ندادند بدانائے فرنگ — ایں قدر ہست کہ چشم نگران دارد

از من ای باد صبا گوی بدانائے فرنگ
عقل نا پاک کشودہ است گرفتار تراست
برق را این بجگر میزند ، آن رام کند
عشق از عقل فسون پیشہ جگر دار تراست
عجب آن نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب آن است کہ بیمار تو بیمار تر است

---

* Intuition. † Intellect.

دانش اندوختہ ای ، دل ز کف انداختہ ای
آہ ازان نقد گرانمایہ کہ در باختہ ای

اس وقت سرزمین مشرق ، عشق و شوق و آرزو کو بالکل فراموش کرچکی ہے اور مغرب میں لوگ دنیاوی امور میں اسیر اور مشرق کے ملک و مال کو لوٹنے کے درپے ہیں - اس اعتبار سے مشرق و مغرب دونوں ویران ہوگئے ہیں :-

خاور کہ آسمان بکمند خیال اوست
از خویشتن گسستہ و بی سوز آرزوست
در تیرہ خاک اوتب و تاب حیات نیست
جولانِ موج را نگران از کنارِ جوست
بتخانہ و حرم ہمہ افسردہ آتشی
پیر مغان شراب ہوا خوردہ درسبوست
فکر فرنگ پیش مجاز آورد سجود
بینای کور و مست تماشای رنگ و بوست
گردندہ تر ز چرخ و رباینده تر زمرگ
از دست او بدامن ما چاک بی رفوست
مشرق خراب و مغرب ازان بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بی ذوق جستجو ست

فی الحقیقت انسان اہل مغرب کی عقل اور اہل مشرق کے عشق ، دونوں سے فیضیاب ہوتا ہے :-

خرد افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظران

ممکن ہے پڑھنے والے کو خیال ہو کہ اگر علامہ اقبال چند اعتبار سے

صوفیاء کے هم عقیده هیں تو پھر اُن سے اختلاف کی کیا صورت هے ؟

انھوں نے اس سوال کا جواب خود هی اپنی کتاب ''تجدید بنای الٰهیات اسلام،،* میں دیا هے ۔ وہ فرماتے هیں : '' جب انسان اپنے اعمال کی بنیاد دینی تعلیمات وعقاید پر رکھے تو اس کے لیے لازمی هے که وہ دل سے ان تعلیمات اور عقاید پر ایمان بھی رکھتا هو اور اس میں ایسا باطنی انقلاب اور تبدیلی پیدا هو که اُسے حقیقی دیندار بنا دے ۔ قدیم صوفیاء نے اپنے خلوص کی بنا پر جب طریقت وسلوک کی بنیاد ڈالی تھی تو بلاشبه انھوں نے مسلمانوں میں اسی قسم کا باطنی انقلاب پیدا کر دیا تھا ۔ لیکن اِس زمانے میں انسان اس قدر ظاهر پرستی کا خوگر هو گیا هے که اس کے افکار میں انقلاب روحانی اور تحوّل باطنی کے قبول کرنے کی وہ صلاحیت نہیں رهی جو قدیم الایام میں تھی ۔ اسوقت تصوف کے جو مختلف گروہ باقی هیں وہ اس دور کے لوگوں کے ذهنی حالات سے ناواقف هیں اور اُن میں اتنی استعداد نہیں که وہ افکار جدید کو اخذ کر سکیں اور عہد حاضر کے لوگوں کے مسائل کو سمجھ سکیں اور ان دو سر چشموں سے اپنی سیرت صوفیانه اور طریق عارفانه کو تقویت پہنچا سکیں ۔ یه لوگ ابھی تک هارے اسلاف کے قدیم طریقوں پر کار بند هیں اور نہایت استقامت کے ساتھ کار بند هیں ، حالانکه هارے اسلاف کا طرز فکر اور تہذیبی انداز کئی ایک اعتبار سے هارے طرز فکر اور تہذیبی انداز سے بہت مختلف هے ۔ همیں چاهیے که هم اسلام کے دینی فلسفے کو اسطرح ازسر نو وضع کریں که وہ ایک طرف اسلامی فلسفیانه طریق پر حاوی بھی هو اور دوسری طرف اُن تمام انقلابات اور وسعتوں کے مطابق بھی هو جو انسانی علم ومعرفت کی گونا گوں ترقیوں کے سلسلے میں واقع هوئی هیں،،

---

* Reconstruction of Islamic Thought

آپ کہیں گے کہ پھر یورپ کے علماً اور حکماء سے اقبال کی اصل نزاع کیا ہے؟ اصل نزاع یہ ہے کہ انیسوی صدی عیسوی میں علم طبیعات ایسے مرحلے پہ پہنچ چکا تھا کہ علماء کی نظر صرف مادہ اور فطرت پر ہی پڑتی تھی اور وہ دین کو قطعی طور پر چھوڑ چکے تھے، اور انہیں اس ذوق و شوق سے جو انسانی دلوں میں پیدا ہوتا ہے مطلق آشنائی نہ تھی۔ لیکن علامہ اقبال کی زندگی کے اُسی دور میں علم طبیعات کے ماہرین نے اپنے علم کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کیا اور وہ مادہ پرستی جو لازمی طور پر اُن میں پیدا ہو گئی تھی، دور ہونے لگی اور عنقریب اب ایسا موقع بھی آئے گا کہ دین اور سائنس میں ایک ایسا اشتراک پیدا ہو جو ابھی تک انسانی ذہن کے تصور میں نہیں آیا، اور اُن میں یکسر موافقت کا رنگ آجائے۔ ساتھ ہی یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ فلسفی کے خیالات کبھی بھی حدیقین تک نہیں پہنچتے۔ جوں جوں علم ترقی کرتا جائے گا انسانی افکار کے لیے نئی نئی راہیں کھلتی جائیں گی۔ اور اس ضمن میں مختلف رائیں اور نظریے وضع ہوتے رہیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہمیشہ فکر انسانی کی ان تبدیلیوں اور ترقیوں کا بغور مطالعہ کریں اور اُن کا انتقادی طور پر جائزہ بھی لیتے رہیں۔

ہای علم تا افتد بدامت یقین کم کن، گرفتار شکی باش

یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال کو شعراء و حکمائے فرنگ میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا کہ وہ اس پر تنقیدی نظر نہ ڈالتے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا اُن میں سے بعض کے نام وہ نہایت احترام سے لیتے ہیں، مثلاً بائرن، کانٹ، ہیگل، نٹشے، ٹالسٹائی، شوپنہاور، آئنسٹائن۔ برگسان اور کبھی کبھی اس تاثر کو ظاہر کرنے کے لیے جو ان لوگوں کے بارے میں اُن کے اپنے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ ایک ایک دو دو شعر اُن کی تعریف میں بھی لکھتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جلال الدین رومی

بلخی یعنی مولوی معنوی وہاں موجود ہیں اور ان تمام بڑی بڑی ہستیوں پر تنقید کرتے چلے جارہے ہیں۔ یورپ کا فقط ایک فلسفی شاعر تھا جسے وہ ارادت و عقیدت کے قابل سمجھتے ہیں، اور وہ گوئٹے الہامی تھا، گوئٹے کے بارے میں اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ مولوی رومی کی طرح

نیست پیغمبر ولی دارد کتاب

لیکن فقط گوئٹے کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو گوئٹے بھی عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے۔ دوسرے اُس نے شرق و غرب کے افکار و اقوال میں موافقت پیدا کی ہے اور انہیں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ گوئٹے کی تصنیف فاؤسٹ* ایک فلسفی کی داستان ہے جو پہلے عقل کے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور یہ راہ چلتے چلتے وہ گمراہ ہو گیا اور شیطان کا مرید بنا اور اس سے یہ عہد و پیمان باندھا کہ بیس سال تک میری آرزوئیں پوری کرو۔ اس کے عوض میری روح تمہاری ہوگی۔ جب بیس سال پورے ہوئے اور ابلیس اس کی روح لینے کے لیے آیا تاکہ اُسے دوزخ میں لے جائے تو وہ فلسفی راضی نہ ہؤا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس اثنا میں فاؤسٹ میں خدمت خلق کے لیے شدید عشق پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اس دھن میں اندھا ہو گیا اور عشق نے اُسے ابلیس کے پنجے سے نجات دلائی۔

گوئٹے کی تصنیف "دیوان غربی و شرقی" ہے جو اس کے غزلیہ اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ دیوان خود جرمنی میں بھی عوام میں قبول نہیں ہؤا۔ لیکن بعض بڑی بڑی ہستیاں اسے بے حد پسند کرتی ہیں۔ ان میں سے جرمنی کا شاعر بزرگ ہیگل ہے جس نے اپنی بعض غزلیات میں اسکا تتبع کیا ہے۔ ہیگل گوئٹے کے دیوان کے بعض اشعار سے سخت متاثر تھا۔ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ جرمن زبان میں ایسے لطیف و روان اشعار کہنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اڈورڈ ڈاؤڈن* نے جو انگلستان کا ایک بڑا فاضل ادیب اور

---

* Edward Dowden (۱۸۴۳ء - ۱۹۱۳ء)

محقق ہے، اس دیوان کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے اور اسے نظم میں بھی سمویا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال نے اپنی کتاب ''پیام مشرق'' گوئٹے کے ''دیوان مغربی'' کے مقابلے میں لکھی تھی، جس میں اس نے مشرق و مغرب کے وہ افکار و اقوال جمع کر دیے ہیں جن سے وہ متاثر ہوئے یا جو ان کی اپنی تراوش طبع کا نتیجہ تھے *

علامہ اقبال سر زمین مغرب کے فلسفیوں اور مفکرین کا بہت احترام کرتے ہیں اور مغرب کے علم اور حکمت اور فلسفہ کے مطالعے کو مشرقیوں کے لیے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کا عقیدہ ہے کہ اہل مشرق کے لیے نجات کا یہ راستہ نہیں اس لیے کہ فلسفہ و حکمت عشق سے عاری ہے :—

حکمت و فلسفہ کاریست کہ پایانش نیست
سیلئی عشق و محبت بدبستانش نیست
دشت و کہسار نوردید و غزالی نگرفت
طوفِ گلشن زد و یک گل بگریبانش نیست

چارہ اینست کہ از عشق کشادی طلبیم
پیش آو سجدہ گزاریم و مرادی طلبیم

عقل کو چاہیے کہ وہ عشق و آرزو سے وابستہ رہے :—

ای خوش آن عقل کہ پہنای دو عالم با اوست
نور افرشتہ و سوز دل آدم با اوست

ڈاؤڈن آئرلینڈ کا ایک مشہور شاعر اور نقاد تھا۔ اس نے انگریزی ادب پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں ''حیات شیلے'' خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

* پیام مشرق کے دیباچے میں علامہ اقبال نے اس امر کی تشریح بھی کر دی ہے اور گوئٹے کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے اس کے بعض تصورات و احساسات کو سراہا بھی ہے۔ (مترجم)

یورپ کے مشرق شناس پرانے دیوتاؤں کو زندہ کرتے ہیں اور ہمیں اُن کی پوجا کرنے پر اکساتے ہیں۔ یہ لوگ ہماری گمراہی کا باعث ہیں :۔

اہرمن را زندہ کرد افسون غرب
روز یزدان زرد رُو از بیم شب

کنعان اور فنیقیہ کا خدائے قدیم ''بعل'' نغمہ گاتے ہوئے کہتا ہے :۔

زندہ باد افرنگیٔ مشرق شناس آنکہ مارا از لحد بیرون کشید

اس لیے اہل مشرق کو یورپ کی تقلید نہیں کرنی چاہیے ، مناسب یہی ہے کہ اُن لوگوں کے اقوال و اعمال کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اس میں سے جو اچھی شے ہو وہ لے لی جائے اور اُن کے تمدن کے ظاہری ٹھاٹھ سے جس میں رقص ، بے دینی ، خط لاطینی ، مختصر لباسی شامل ہیں ، دھوکا نہ کھائیں *

شرق را از خود برد تقلید غرب باید این اقوام را تنقید غرب
قوت مغرب نہ از چنگ و رباب نی ز رقص دختران بی حجاب
نی ز سحر ساحران لالہ روست نی زعریان ساق و نی از قطع موست
محکمی اُو را نہ از لادینی است نی فروغش از خط لاطینی است
قوّت افرنگ از علم و فن است از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست مانع علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را ای جوان شوخ و شنگ مغز می باید نہ ملبوس فرنگ
اندرین رہ جز نگہ مطلوب نیست ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکر چالاکی اگر داری ، بس است طبع درّاکی اگر داری ، بس است

* ترکوں نے اہل مغرب کی تقلید کی ہے - یہاں اُن کی عورتوں کی نیم برہنگی کے انداز کا لباس اور ترکی زبان کے سلسلے میں خط لاطینی کو رسم الخط کے طور پر اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے (مترجم)

جب شروع شروع میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کا ظہور ہؤا ، تمام اہل مشرق آن سے خوش تھے اور سب نے آن کے بارے میں ذوق و شوق کا اظہار کیا ۔ اُمید کی جاتی تھی کہ اگر مشرق کی ایک قوم بیدار ہوئی ہے اور ترقی کی راہ میں گامزن ہے تو شاید دوسری مشرقی اقوام بھی ایسے ہی بیدار ہونگی ۔ علامہ موصوف نے بھی اسی طرح محبت و عقیدت کا اظہار کیا اور کچھ اشعار بھی آن کی مدح میں لکھے ۔ لیکن وہ جلد ہی مصطفیٰ کمال اور ترکوں سے مایوس ہوگئے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دیکھا کہ وہ لوگ یورپ کی تقلید کر رہے ہیں ۔ بجائے اس کے کہ وہ علم و حکمت اور عقل و معرفت کو اپنا نصب العین بناتے وہ رقص ، بے دینی ، کلاہ فرنگی ، اور خط لاطینی میں کھو گئے ہیں ۔ چنانچہ اسی موقع پر انھوں نے فرمایا :۔

مغز می باید نہ ملبوس فرنگ

اور اسی موقع کے متعلق فرمایا :۔

نہال ترک ز برق فرنگ بار آورد ظہور مصطفوی را بہانہ بولہبی است

اور سعید حلیم پاشا کا قول بیان کرتے ہوئے کہا :۔

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود گفت ''نقش کہنہ را باید زدود''
نو نگردد کعبہ را رخت حیات گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگ نو درچنگ نیست تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ او را دمی دیگر نبود در خمیرش عالمی دیگر نبود

اور ابدالی شاعر افغانی کے قول کے سلسلے میں لکھتے ہیں :۔

گر کسی شبہا خورد دود چراغ گیرد از علم و فن و حکمت سراغ
ملک معنی کس حد او را نبست بی جہاد پیہمی ناید بدست
ترک از خود رفتہ و مست فرنگ زہر نوشین خوردہ از دست فرنگ
زانکہ تریاق عراق از دست داد من چہ گویم جز ''خدایش یارباد''

بندۂ افرنگ از ذوق نمود　　می برد از غربیان رقص و سرور
نقد جان خویش در بازد بلهو　　علم دشوار است ، میسازد بلهو
از تن آسانی بگیرد سهل را　　فطرت آو در پذیرد سهل را
سهل را جستن در ایں دیر کہن　　این دلیلِ آنکه جان رفت از بدن

پھر فرماتے ھیں کہ جس طرح مصطفٰی کمال پاشا سے غلطی ھوئی ، اسی طرح قائد ایران اور اھل ایران بھی غلط راہ پر چل رھے ھیں۔ جاوید نامے میں جہاں آن کی روحانی سیر کا ذکر ھے وہ لکھتے ھیں کہ میں نے نادر شاہ کو دیکھا ، وہ مجھ سے کہہ رھے ھیں :-

محرم رازیم با ما راز گوی　　آنچه می دانی ز ایران باز گوی

میں نے جواب دیا کہ ایران یورپ کی تقلید کر رھا ھے ۔ بجائے اس کے کہ ایرانی اسلام کی عنایات کا حق پہچانتے اور تمدن اسلامی کے فوائد کو سمجھتے، انھوں نے اپنی قدیم تاریخ کو جو فرنگیوں کی کتابوں سے پڑھی ھے سامنے رکھا ھے اور وہ عربوں سے دشمنی کا اظہار کررھے ھیں :-

بعد مدت چشم خود برخود کشاد　　لیکن اندر حلقۂ دامی فتاد
کشتۂ ناز بتانِ شوخ و شنگ　　خالق تہذیب و تقلید فرنگ

کار آن وارفتۂ ملک و نسب　　ذکر شاپور است و تحقیر عرب
روزگار آو تہی از واردات　　از قبور کہنه می جوید حیات
باوطن پیوست و ازخود درگذشت　　دل به رستم داد و از حیدرگذشت
نقش باطل می پذیرد از فرنگ　　سرگذشت خود بگیرد از فرنگ

حالانکہ اگر عرب نے ایران پر حملہ کیا تو اس میں ایرانیوں کو کوئی نقصان نہیں پہونچا ۔ حملۂ عرب کے وقت ایران فرسودہ ھوچکا تھا اور اس کے تمام قوانین اور نظام پرانے ھوچکے تھے ۔ صحرا سے ایک مرد اٹھا اور آس نے ایران میں ایک تازہ روح بھر دی ، اگر یقین نہ آئے تو آنکھیں

کھولو اور دیکھو کہ ایران مسلمان ہؤا، اب تک زندہ ہے۔ لیکن رومۃ الکبریٰ (روم مشرقی) جس نے اسلام کو قبول نہ، کیا آج صفحۂ ہستی سے یکسر مٹ چکا ہے :-

پیریِ ایران زمان یزد جرد　　چہرۂ اُو بی فروغ از خون سرد
دین و آئین و نظام او کہن　　شید و تار صبح و شام او کہن
موج می در شیشۂ تاکش نبود　　یک شرر در تودۂ خاکش نبود
تا ز صحرای رسیدش محشری　　آنکہ داد آو را حیات دیگری
ایں چنین حشر ازعنایات خداست　　پارس باقی، رومتہ الکبریٰ کجاست؟
مرد صحرائی بایران جان دمید　　باز سوی ریگ زار خود رمید
کہنہ را از لوح ما بسترد ورفت　　برگ و ساز عصر نو آورد و رفت
آہ احسان عرب نشناختند　　ز آتش افرنگیان بگداختند

ایسے اہل یورپ کا فریب نہیں کھانا چاہئے جو ہماری پستی اور دیگر عیوب کو ہمارے مسلمان ہونے پر محمول کرتے ہیں اور اس بات کے دعویٰ دار ہیں کہ وہ ہمیں راہ نجات کی طرف رہنمائی کررہے ہیں :-

غربیان را شیوہ های ساحری است
تکیہ جز بر خویش کردن کافری است

روح را بار گران آئین غیر　　گرچہ آید زآسمان آئین غیر

ہمیں دوسروں سے مدد نہیں طلب کرنی چاہیے بلکہ اپنا کام خود کرنا چاہیے :—

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش　　براہ دیگران رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید　　گناہی ہم اگر باشد ثواب است

اہل یورپ کی تمام کوششیں اسی بات پر مرکوز ہیں کہ وہ ہمیں اسیر بنائے رکھیں۔ ہمیں آن سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے :-

ترا نادان آمید غمگساری‌ها ز افرنگ است
دل شاهین نسوزد بهر آن مرغی که درچنگ است
پشیمان شو اگر لعلی ز میراث پدر خواهی
کجا عیش برون آوردن لعلی که در سنگ است

اهل یورپ کے افکار ، آن کا نظام و آئین ہمارے درد کا مداوا نہیں :-

مثل آئینہ مشو محو جمالِ دگران ازدل‌ودیدہ فروشوی خیال دگران

یورپ میں ذوق و شوق کی شدت نہیں :-

قدح‌خرد فروزی که فرنگ‌داد مارا همه آفتاب لیکن اثر سحر ندارد

ای خوش آن جوی تنک مایه که از ذوق خودی
در دل خاک فرو رفت و بدریا نرسید
از کلیمی سبق آموز که دانای فرنگ
جگر بحر شگافید و بسینا نرسید

ہماری اخلاق تعلیم اور دینی آئین بھی فرنگیوں سے الگ ہے : —

مصلحت در دین ماجنگ وشکوه مصلحت در دین عیسٰی غار و کوه

اگر انسان شیر کی طرح زندگی بسر کرے تو اس زندگی کی شجاعت اور مردانگی کا ایک لمحہ ، بھیڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے :—

زندگی را چیست رسم ودین و کیش یکدم شیری به ازصد سال میش

جو شخص زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ، اسے چاہیے کہ وہ تکلیفوں اور خطروں سے روگردانی نہ کرے :-

غزالی با غزالی درد دل گفت ازیں پس در حرم گیرم کنامی
بصحرا صید بندان در کمین اند بکام آهوان صبحی نه شامی

امان از فتنهٔ صیاد خواهم
دلی زاندیشهٔ آزاد خواهم

رفیقش گفت ای یار خرد مند — اگر خواهی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن را بر فسان زن — ز تیغ پاک گوهر تیز تر زی
خطر تاب وتوان را امتحان است
عیار ممکنات جسم و جان است

یہاں تک کہ انسان کو اس سے بھی آگے نکل جانا چاہیے اور خطرات کا استقبال کرنا چاہیے اور بے خطر راستوں سے بچ کر چلنا چاہیے : —

بکیش زنده دلان زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبه نه کردم که راه بے خطر است

جو لوگ بے خطر راہوں پہ چلتے ہیں وہ پست ہمت ہیں : —

وای آن قافله کز دونی همت میخواست
رهگزاری که در و هیچ خطر پیدا نیست

زندگی کی بنیاد سعی عمل کے سوا کچھ نہیں : —

زندگی جهد است واستحقاق نیست — جز بعلم انفس و آفاق نیست

جو شخص میدان کے ایک گوشے میں کھڑا رہتا ہے اور گرمی کار زار کو دور سے دیکھتا ہے وہ لذت زیست سے نا آشنا ہے : —

سکندر باخضر خوش نکته‌ای گفت — شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنار عرصه بینی — بمیر اندر نبرد و زنده تر شو

میارا بزم بر ساحل که آنجا — نوای زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز — حیات جاودان اندر ستیز است

پھر فرماتے ہیں کہ ساحل چونکہ حرکت نہیں کرتا اس لیے اپنی ہستی ونیستی اور بود ونبود سے بےخبر رہتا ہے ۔ لیکن لہریں حرکت

کرتی ہیں اور زندگی کی لذت سے آشنا ہوتی ہیں - بھرتری ہری کے دو شعروں کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

این جہانی کہ تو بینی اثر یزدان نیست
چرخہ ازتست وہم آن رشتہ کہ بر دوک تو رشت
پیش آئین مکافات عمل سجدہ گزار
زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

جس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا وہ حسن وجمال سے عاری تھی - اس میں جس قدر حسن و زیبائی اور رعنائی پائی جاتی ہے وہ سب انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ہے - انسان اور خدا کے درمیان گفتگو ہوتی ہے ، خدا انسان کو طعنہ دیتا ہے کہ تو نے اس عالم ایجاد میں خلل پیدا کیا اور آلات جنگ وحرب بنائے :—

جہاں را زیک آب وگل آفریدم تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

لیکن انسان ایسا نہیں کہ خاموش رہتا ، کیا خوب جواب دیا :—

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

حسن وقبح کا معیار اور خوبصورتی اور بد صورتی کا انداز جو کچھ بھی مقرر ہے وہ سب کا سب انسان ہی کی چشم ذوق کا نتیجہ ہے - وہی ہے جو ایک شے کو حسین اور دوسری کو قبیح کہتا ہے - خدا نے اسے

ایک وحشی اور کرخت حیوان پیدا کیا تھا جو دوسرے جانوروں سے مختلف نہ تھا بلکہ بعض وجوہ سے اُن سے بدتر تھا ، اپنی ذاتی ہمت کی بنا پر جو کچھ تھا اُس سے بہتر ہو گیا ۔ انسان اتنا کم مایہ نہیں بلکہ برعکس اس کے اس میں ایسی صفات اور خصوصیات ہیں جو نہایت قابل قدر ہیں ۔ جس روز ایک مٹھی بھر خاک اور چند پانی کے قطروں سے گل آدم کو تیار کیا گیا ، گفتگو کا دروازہ کھلا اور راز وجود کو فاش کیا گیا : —

بر خیز کہ آدم را هنگام نمود آمد
این مشت غباری را انجم بسجود آمد
آن راز کہ پوشیدہ درسینۂ هستی بود
از شوخیٔ آب وگل درگفت و شنود آمد

جبرئیل بھی اپنی عظمتوں کے باوجود انسان کی خاک پا کو نہیں پہنچ سکتے : —

باوج مشت غباری کجارسد جبریل — بلند نامیٔ او از بلندیٔ بام است
تو از شمار نفس زندہ ای ، نمیدانی — کہ زندگی بشکست طلسم ایام است

دراصل جس کو عالم وجود کہتے ہیں ، فقط انسانی تخیل ہی کا کرشمہ ہے ۔ ہم جو دیکھتے ہیں وہ ہے اور جو ہمیں نظر نہیں آتا وہ نہیں ہے ۔ اس اعتبار سے ہم کائنات کو پروردگار کی خلاقیت کا نشان کیسے کہ سکتے ہیں : —

هستی و نیستی از دیدن و نادیدن من
چہ زمان و چہ مکان ، شوخیٔ افکار من است
آن جهانی کہ در و کاشتہ را می دروند
نور و نارش همہ از سبحہ و زنار من است
ساز تقدیرم و صد نغمۂ پنهان دارم
هر کجا زخمۂ اندیشہ رسد ، تار من است

ای من از فیض تو پاینده ، نشان تو کجاست
این دوگیتی اثر ماست ، جهان تو کجاست

یہاں تک کہ جس شے کو انسان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے وہی اس کی شان امتیاز ہے ، درد و بیتابی ، اشک رواں ، غم روزگار ، سب کے سب انسان کی سربلندی کا سرمایہ ہیں ۔ زبور عجم میں خدا کو مخاطب کر کے پوچھتے ہیں ۔ کیا ان چیزوں میں سے تیرے پاس کچھ ہیں ؟

بجہان درد مندان تو بگو چہ کار داری ؟
تب و تاب ما شناسی ؟ دل بیقرار داری ؟
چہ خبر ترا ز اشکی کہ فروچکد زچشمی
تو ببرگ گل زشبنم در شاہوار داری ؟
چہ بگویمت ز جانی کہ نفس نفس شمارد
دم مستعار داری ؟ غم روز گار داری ؟

اس سے بھی بالا تر انسان کا دل ہے ، اگر حافظ شیرازی عشق کو حسنِ پروردگار کی جلوہ گری کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور انسان کو اس عشق کی امانت گاہ تصور کرتے ہیں تو اقبال آدمی کو تگ و پوی عشق کا حاصل قرار دیتے ہیں اور اس مشت خاکی کو جس کے سینے میں دل ہے ، ساری کائنات سے گراں تر سمجھتے ہیں : ـــ

عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است
جلوۂ او آشکار از پردۂ آب و گل است
آفتاب وماہ و انجم میتوان دادن زدست
در بہای آن کف خاکی کہ دارای دل است

لیکن دل فقط گوشت ، چربی ، رگ وخون ، ہی نہیں جو ہمارے سینے کے صندوق میں بند ہے ، بلکہ دل وہ دل ہے کہ درد سے آشنا ہو : ـ

8861
INDIAN INSTITUTE OF ISLAMIC

تنی پیدا کن از مشت غباری　　تنی محکم‌تر از سنگین حصاری
درون او دل درد آشنای　　چو جوی در کنارِ کوهساری

دل وہ ہے جو سوز آرزو اور آتش تمنا سے پیچ وتاب میں ہو :-

زدست ساقی خاور دو جام ارغوان درکش
که از خاک تو خیزد نالۂ مستانه پی در پی
دلی کُو از تب وتاب تمنا آشنا گردد
زند بر شعلۂ خود صورت پروانه پی در پی

تمنا اور آرزو دل کی زندگی کا سرمایہ ہیں ، انسان کی موت اس وقت واقع ہوتی ہے جب وہ کوئی نئی آرزو پیدا نہیں کر سکتا ۔ جیسا کہ قدما کا قول ہے ، پانی کی تلاش نہیں کرنی چاہیے بلکہ تشنگی پیدا کرنی چاہیے ، طبیب کی نہیں بلکہ درد کی جستجو ضروری ہے ۔ علامہ فرماتے ہیں : اگر آرزو اور تمنا میں شدت ہے تو مقصد ضرور حاصل ہوگا ، عقل بھی جو ساری کون و مکان کا ایک لمحہ میں جائزہ لے لیتی ہے ، آرزو ہی کی مخلوق ہے :-

دل ز سوز آرزو گیرد حیات　　غیر حق میرد چو او گیرد حیات
چوں ز تخلیق تمنا باز ماند　　شہپرش بشکست واز پرواز ماند
آرزو هنگامه آرای خودی　　موج بیتابی ز دریای خودی
آرزو صید مقاصد را کمند　　دفتر افعال را شیرازه بند
زنده را نفی تمنا مرده کرد　　شعله را نقصان سوز ، افسرده کرد

عقل ندرت کوش و گردون تاز چیست ؟
هیچ می دانی که این اعجاز چیست ؟
زندگی سرمایه دار از آرزوست
عقل از زائندگانِ بطن اوست

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر اقبال کے افکار و اشعار کے اہم ترین پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں ، اور ہم اس کے بنیادی فلسفے سے آشنا ہوتے ہیں ۔ وہ تمام نکات جو ہم نے اب تک اُن کے اشعار سے مستنبط کیے، بطور تمہید کے تھے ۔ فلسفۂ اقبال کو فلسفۂ خودی یا فلسفۂ سخت کوشی کہا جاتا ہے ۔ خودی سب کچھ ہے ۔ وہی شے ہے جسے بعض لوگ شخصیت کہتے ہیں ۔ خودی وہی ہے جسے ناصر خسرو مکرراً لفظ خویشتن سے تعبیر کرتے ہیں مثلاً اس شعر میں : —

خویشتن خویش را رونده گمان بر هیچ نشسته نه نیز خفته مبر ظن

خودی وجود انسان میں تمام موروثی رجحانات اور اکتسابی تجربات زندگی کی تاثیرات کی وحدت کا نام ہے ۔ خودی اس سوال کا جواب ہے جو قدما پوچھا کرتے تھے کہ جب کوئی کہتا ہے ”میں“ تو کیا مقصد ہوتا ہے؟ روح یا جسم؟ یا دونوں؟ خودی وہی ہے جسے یورپین زبانوں میں Ego کہتے ہیں جس کا پہچاننا ہر انسان کا فرض ہے : —

وجود کہسار و دشت و در هیچ جہاں فانی ، خودی باقی ، دگر هیچ
دگر ازشنکر* ومنصور کم گوی خدا را هم براه خویشتن جوی
بخود گم بہر تحقیق خودی شو انا الحق گوی و صدّیق خودی شو

خودی سر چشمۂ جہاں ہے اور شخصی اور انفرادی زندگی کا انحصار استحکام خودی پر ہے اور خودی کی زندگی آرزو سے ہے : —

از خودی طرح جہانی ریختند دلبری با قاهری آمیختند
هر کجا پیدا و نا پیدا خودی بر نمی تابد نگاه ما خودی
نارها پوشیده اندر نور اوست جلوه های کائنات از طور اوست
هر زمان ، هر دل درین دیر کہن از خودی در پرده میگو ید سخن

---

* شنکر آٹھویں صدی عیسوی مطابق دوسری صدی ہجری میں گزرا ہے ۔ فلسفۂ ہندی کا مشہور عالم تھا ۔ منصور سے مراد حسین منصور حلّاج ہے ۔

هر که ازنارش نصیب خود نبرد　　در جهان ز خویشتن بیگانه مرد
زندگی شرحِ اشارات خودی است　　لا و الّا از مقامات خودی است

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گرد خود گردنده چون پرکار باش
منکر حق نزد ملّا کافراست
منکر خود نزد من کافر تراست
زندگی جز لذت پرواز نیست
آشیان با فطرتِ او ساز نیست
رزق زاغ و کرگس اندر خاک گور
رزق بازان در سواد ماه و هور

انسان کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک وہ معرفت نفس ، تملک نفس اور تسلط نفس کے طریق پر نہیں چلتا ۔ یہاں تک خدا کو بھی نور خودی ھی سے دیکھنا چاھیے : ۔

مشو نومید ازین مشت غباری　　پریشان جلوۂ نا پایداری
چو فطرت میتراشد پیکری را　　تماشش میکند در روزگاری

جہان رنگ و بو فہمیدنی ہست　　درین وادی بسی گل چیدنی ہست
ولی چشم از درون خود نبندی　　کہ در جان تو چیزی دیدنی ہست

زمن گو صوفیان با صفارا　　خدا جویان معنی آشنا را
غلام ہمت آن خود پرستم　　کہ بانور خودی بیند خدا را

خدا بندے سے کہتا ھے کہ اگر تو مجھے پہچاننا چاھتا ھے اور راز عالم سے آگاھی چاھتا ھے تو اپنے آپ کو دیکھ اور کائنات کو اپنے میں

جذب کرلے :۔

زندگی خواهی خودی را پیش کن　　چار سو را غرق اندر خویش کن
باز بینی من کیم تو کیستی　　درجهان چون مردی و چون زیستی

زردشت اهرمن کے جواب میں کہتا ہے کہ زندگی نفس کو وسعت دینے اور تکمیل نفس میں سختی برداشت کرنے کا نام ہے۔ انسان بحر نور کی لہروں میں سے ایک لہر ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ سمندر کے ساحل پر جو عین ظلمت ہے، حملہ آور ہو اور اهرمن کو قتل کرے اور اس کے خون سے پوشیدہ حقایق کو لکھے۔

نور دریای است، ظلمت ساحلش　　همچو من سیلی نژاد اندر دلش
اندر و نم موجهای بے قرار　　سیل را جز غارت ساحل چه کار
نقش بیرنگی که اورا کس ندید　　جز بخون اهرمن نتوان کشید
خویشتن را وا نمودن زندگی است　　ضرب خود را آزمودن زندگیست
از بلاها پخته تر گردد خودی　　نا خدا را پرده در گردد خودی

" اسرار خودی " جو علامه موصوف کی پہلی فلسفیانه منظوم کتاب ہے، تمام کی تمام خودی ہی کے موضوع پر ہے اور اس میں انسان کو خودی کی پرورش ہی کی تلقین کی ہے۔ اس میں پہلا موضوع* : یه ہے " اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد "۔ اس موضوع کے اشعار کا خلاصه یه ہے :۔

پیکر هستی ز آثار خودی است　　هرچه می بینی زاسرار خودی است
صد جهان پوشیده اندر ذات او　　غیر او پید است از اثبات او
وسعت ایام جولانگاه او　　آسمان موجی زگرد راه او
وا نمودن خویش را خوی خودی است
خفته در هر ذره نیروی خودی است

---

* نظام

چون حیات عالم از زور خودی است — پس بقدر استواری زندگیست
قطره چون صرف خودی از بر کند — هستی بی مایه را گوهر کند
سبزه چون تاب دمید از خویش یافت — همت او سینهٔ گلشن شکافت
چون زمین بر هستئی خود محکم است — ماه پابند طوافِ پیهم است
هستئی مهر از زمین محکم تر است — پس زمین مسحور چشم خاوراست

چون خودی آرد بهم نیروی زیست
می کشاید قلزمی از جوی زیست

اس کتاب کی دوسری فصل کا موضوع یه هے که " حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است " یعنی اگر آدمی کی خودی همیشه کسی تازه مقصد و مراد کو اپنے لیے وضع نه کرتی رهے تو اس کا تعین اور اس کی انفرادیت زائل هو جاتی هے - بلکه یه عشق و آرزو هی هے که جو انسان کی تخلیق اور اس کے قوای باطنی اور حواس ظاهری کی پیدائش کا باعث هؤا : -

زندگانی را بقا از مدعاست — کار دانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیده است — اصل او در آرزو پوشیده است
آرزو را در دلِ خود زنده دار — تا نگردد مشت خاک تو مزار
آرزوی کو بزورِ خود شکست — سرز دل بیرون زد وصورت ببست
دست و دندان و دماغ و چشم و گوش — فکر و تخئیل و شعور و یاد و هوش
زندگی مرکب چو در جنگاه تاخت — بهر حفظ خویش این آلات ساخت
آگهی از علم و فن مقصود نیست — غنچه وگل از چمن مقصود نیست
علم از سامان حفظ زندگیست — علم از اسباب تقویم خودی است
علم و فن از پیشخیزان حیات — علم و فن از خانه زادان حیات

ما ز تخلیق مقاصد زنده ایم
از شعاع آرزو تابنده ایم

اس موضوع پر جاوید نامے میں فرماتے ہیں : -

زندگی هم فانی و هم باقی است　　این همه خلاقی و مشتاقی است

زنده ای؟ مشتاق شو، خلّاق‌شو　　همچو ما گیرندۂ آفاق شو

در شکن آن را که ناید سازگار　　از ضمیر خود دگر عالم بیار

تیسری فصل کا موضوع ہے " خودی ازعشق و محبت استحکام می پزیرد" اس میں سے یہ اشعار نہایت عمدہ ہیں : -

نقطۂ نوری که نام او خودیست　　زیر خاک ما شرار زندگیست

از محبت میشود پاینده تر　　زنده تر ، سوزنده تر، تابنده تر

از محبت اشتعال جوهرش　　ارتقای ممکنات مضمرش

فطرت او آتش اندوزد ز عشق　　عالم افروزی بیاموزد زعشق

عشق را از تیغ وخنجر باک نیست　　اصل عشق‌از آب‌وبادوخاک نیست

عاشقی آموز و محبوبی طلب　　چشم نوحی ، قلب ایوبی ، طلب

کیمیا پیدا کن از مشت گلی　　بوسه زن بر آستان کاملی

شمع خودرا همچو رومی برفروز　　روم را در آتش تبریز سوز

ما که از قید وطن بیگانه ایم　　چون نگه نور دو چشمیم ویکیم

از حجاز و چین و ایرانیم ما　　شبنم یک صبح خندانیم ما

مست چشم ساقی بطحا ستیم
در جهان مثل می و مینا ستیم

چوتھی فصل کا موضوع یہ ہے کہ سوال کرنے سے خودی کمزور پڑ جاتی ہے - انسان کتنا ہی تنگدست اور مفلوک‌الحال کیوں نہو ، اُسے دوسرں کے احسان کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہیے : -

ای خنک آن تشنه کاندر آفتاب　　می نخواهد از خضر یک جام آب

پانچویں فصل میں وہ اس امر پر بحث کرتے ہیں کہ جب عشق و محبت سے خودی مستحکم ہوتی ہے تو کائنات کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو مسخّر کر لیتی ہے :-

از محبت چون خودی محکم شود　　قوّتش فرماندۂ عالم شود

چھٹی فصل میں وہ اس مضمون کی ایک حکایت درج کرتے ہیں کہ نفی خودی (یعنی فنای نفس ، نفسانی لذات کو ترک کرنا ، حقیر اور مختصر زندگانی پر قناعت کرنا ، فقیری و درویشی کی خوڈالنا) محکوم قوموں کا شیوہ ہے ، وہ چاہتی ہیں کہ ان طریقوں سے اقوام غالب کے اخلاق وفطرت کو کمزور کردیں - فرماتے ہیں کہ چند بھیڑیں ایک چراگاہ میں رہتی تھیں - اور چونکہ نعمتوں کی فراوانی تھی اس لیے انھیں زندگی میں کسی تکلیف سے کوئی سروکار نہ تھا - کچھ شیر جنگل سے باہر نکلے اور آن پر غالب آ گئے اور آن کی آزادی سلب کرلی - اس طرح سالہا سال گزر گئے، یہاں تک کہ :-

گوسفندی زیرکی فہمیدہ ای　　کہنہ سالی گرگ باران دیدہ ای

آس بھیڑ نےاپنی قوم کے تحفظ اور شیروں سے انتقام لینے کیلیے ایک تدبیر سوچی - دل میں کہنے لگی کہ بھیڑوں کو سمجھا بجھا کر شیر تو نہیں بنایا جاسکتا ، البتہ شیر نر کو بھیڑ بنایا جاسکتا ہے - چنانچہ آس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میں ایک نئی شریعت لے کر آئی ہوں - سنو سب کے سب گھاس کھاؤ اور حیوانی گوشت کھانا چھوڑ دو - خداتعالیٰ نے بہشت برین کمزوروں کے لیے بنائی ہے - وہ طاقتوروں کو دوزخ میں بھیجے گا :-

هر که باشد تند وزورآورشقی است　　زندگی مستحکم ازنفی خودی است
روح نیکان از علف یابد غذا　　تارک اللحم است مقبول خدا
ذره شو ، صحرا مشو ، گر عاقلی　　تا ز نور آفتابی بر خوری

ای که می نازی بزبح گوسفند / ذبح کن خود را که باشی ارجمند
زندگی را میکند نا پایدار / جبر و قہر و انتقام و اقتدار
سبزه پامال است و روید بار بار / خواب مرگ ازدیده شوید بار بار
غافل از خود شو اگر فرزانه ای / گر نه خود غافل نه‌ای، دیوانه‌ای
چشم بند وگوش بندو لب به بند / تا رسد فکرتو بر چرخ بلند

این علف زار جهان هیچ است هیچ
تو برین موهوم ، ای نادان مپیچ

جب نبوت کا دعویٰ کرنے والی بھیڑ نے یہ باتیں کہیں تو شیروں نے جو کام کی سختی اور محنت سے تھکے ماندے ہو رہے تھے اور آن کی طبیعت تن آسانی اور تن پروری کی طرف مائل تھی ، اس کے دین کو پسند کیا اور کام چھوڑ دیا اور رفتہ رفتہ بے ہمتی اور پستی میں کھو گئے ، شیروں کی خصلت بھیڑوں کی طبیعت میں بدل گئی :-

شیر بیدار از فسون میش خفت / انحطاط خویش را تہذیب گفت

پھر ساتویں فصل میں لکھتے ہیں کہ افلاطون یونانی جس کے افکار سے اقوام اسلامیہ کے تصوف اور ادبیات پر گہرا اثر پڑا ہے ، بھیڑوں ہی کے مسلک پر چلتا رہا ہے اس کے خیالات سے بچنا چاہیے :-

راهب دیرینه افلاطون حکیم / از گروه گوسفندان قدیم
رخش او در ظلمت معقول گم / در کہستان وجود افگنده سُم
آنچنان افسوس نامحسوس خورد / اعتبار از دست وچشم وگوش برد
گفت ، سرّ زندگی در مردنست / شمع را صد جلوه از افسردنست
عقل خود را بر سر گردون رساند / عالم اسباب را افسانه خواند
فکر افلاطون زیان را سُود گفت / حکمت او بود را نابود گفت
فطرتش خوابید وخوابی آفرید / چشم هوش او سرابی آفرید
بس که از ذوق عمل محروم بود / جان او وارفتهٔ معدوم بود

منکر هنگامهٔ موجود گشت
خالق اعیان نامشهود گشت

لیکن اقبال ان باتوں کا یوں جواب دیتے هیں :-

زنده جان را عالم امکان خوشست — مرده دل را عالم اعیان خوش است
راهب ما چاره غیر از رم نداشت — طاقت غوغای این عالم نداشت
قومها از سکر او مسموم گشت — خفت و از ذوق عمل محروم گشت

ایک اور جگه فرماتے هیں :-

حربهٔ دون همتان کین است و بس — زندگی را این یک آئین است و بس
زندگانی قوت پیداستی — اصل او از ذوق استیلاستی
عفو بیجا سردیِ خون حیات — سکته ای در بیت موزون حیات

هر که در قعر مذلت مانده است
نا توانی را قناعت خوانده است

میرے خیال میں یهاں عقیدهٔ افلاطوں اور اس پر علامهٔ اقبال کے اعتراضات کی مختصر سی توضیح کردینی ضروری هے - جو لوگ فلسفیانه اصطلاحوں اور افلاطوں کے عقیدوں سے واقف هیں وہ جانتے هونگے که افلاطوں کا عقیده یه تها که جو کچھ هم دنیا میں دیکھتے هیں وہ ایسے ظواهر هیں جو همیشه بدلتے رهتے هیں - لیکن محسوسات کی اس خارجی دنیا میں ایسے حقائق اور معانی پوشیده هیں جو اس تغیر سے محفوظ هیں - افلاطوں ان غیر متغیر کو لفظ '' اعیان ثابته '' یا ''مثل'' سے پکارتا هے - اس کا عقیده هے که عقل محض کے ذریعے ان غیر متغیر حقائق کی معرفت ممکن هے اور هارے ظاهری حواس کا اس معرفت سے کوئی واسطه نهیں ، کیونکه یه حواس ان ظواهر متغیر سے دهوکا کها جاتے هیں - هاری آنکھیں جو کچھ دیکھتی هیں وہ ایسے سایه کی طرح هیں جو متحرک اجسام کی حرکت سے کسی دیوار پر پڑتا هے - همیں ان اجسام سے واقفیت نهیں هوتی - لیکن

اسی سائے کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ اس لیے لازمی ہے کہ ہم ان محسوسات سے قطع نظر کرکے محض استدلال و استنباط سے ان حقایق کو معلوم کریں۔

اس بات کو سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ افلاطون کا خیال ہے کہ جو کچھ ہم حواس کے ذریعے دیکھتے ہیں وہ سوائے وہم و گمان کے اور کچھ نہیں۔ علامہ کہتے ہیں کہ یہ خیال محض خواب کی باتیں ہیں۔ افلاطون عالم موجودات کا منکر ہے اور عالم خواب و خیال میں موہومات کی تخلیق کرتا ہے :-

از نشمین سوی گردون پر کشود　　باز سوی آشیان نامد فرود

درخم گردون خیال او گمست　　من ندانم دُرد یا خشت خم است

افلاطون کے افکار کا جو اثر تصوف اسلامی پر پڑا ہے، پروفیسر نکلسن مرحوم نے ترجمہ اسرار خودی میں اس کی توضیح کی ہے، جسے نقل کرنا یہاں مناسب ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ ”مذہب افلاطون کا مستقل اثر مسلمانوں کے افکار پر کچھ زیادہ نہیں پڑا۔ مسلمانوں نے شروع میں جب یونانی فلسفے کو اخذ کرنا شروع کیا تو انھوں نے ارسطو کی طرف توجہ دی۔ اس میں بھی انھیں ارسطو کی اصل تصنیفات ہاتھ نہ لگ سکیں، بلکہ انھوں نے صرف اُن کتابوں کے ترجمے پڑھے جو ارسطو کے نام سے منسوب تھیں۔ دراصل یہ کتابیں جدید افلاطونی حکماء کی تصنیف تھیں، مسلمانوں نے جن عقائد کو ارسطو کے عقائد سمجھ لیا وہ دراصل فلوطینس *، پروقلس † اور اسکندریہ کے حکماء متاخرین کا فلسفہ تھا، جو جدید افلاطونی فلسفہ کے معتقد تھے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے ذہنی اور روحانی انقلاب وارتقا پر افلاطون کا بلا واسطہ بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ ہم اُسے اسلامی تصوف کا سرچشمہ نہ کہیں، نہ سہی، تاہم مسلمانوں کے متصوفانہ افکار کا دارومدار اسی فلسفے پر ہے۔“

---

* Plotinus.　　† Proclus.

علامہ اقبال نے خود بھی اپنے ایک خط میں جو انھوں نے نکلسن مرحوم کے نام لکھا تھا، اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خط ''اسرار خودی'' کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں درج ہے۔ علامہ موصوف کہتے ہیں: ''افلاطون سے میرا اختلاف اُن فلسفیانہ نظریات کی وجہ سے ہے جو حیات کی بجائے ممات کو انسان کا انتہائی مقصد سمجھے ہوئے ہیں اور ہیولٰی اور مادہ سے جو زندگی کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، غافل ہیں۔ اور اس مادے * کو فنا کرنے کی جگہ ہمیں اُس سے بھاگنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ زبور عجم میں یہ قطعہ اسی موضوع پر ہے:۔

دانش مغربیان فلسفہ مشرقیان
ہمہ بتخانہ و درطوف بتان چیزی نیست
از خود اندیش و ازین بادیہ ترسان مگذر
کہ تو ہستی و وجوددوجہان چیزی نیست

اسرار خودی کی آٹھویں فصل کا عنوان ''در حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ'' ہے۔ اس سلسلے میں علامہ فرماتے ہیں کہ انسانی زندگی کی بنا آرزو اور تمنا پر ہے اور زندگی سے مراد تسخیر ہے اور تمنا اس افسون کی مانند ہے جو اس تسخیر کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ یہ تمنا کہاں سے آتی

---

* یہی تعلیم جو علامہ اقبال ان فلسفیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اپنی ماہیت کوظاہر کرتی ہے۔ اوریگنس، فلوطینس، فرحوزیوس اور اسکندریہ کے دوسرے تمام یونانی فلسفی جو عیسائی تھے اور جنھوں نے فلسفۂ دین مسیحی کی بنیاد رکھی تھی مادے سے منحرف تھے نہ کہ افلاطون۔ ان فلسفیوں نے افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کی تشریح کی تھی اور اُن کے عقاید کی اپنے ذہنی رجحانات کے مطابق تاویل بھی کی تھی اور پھر یہی شرعیں عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ تصوف اسلامی کے نشو ارتقا میں ان کا بہت گہرا اثر موجود ہے۔ مسلمان ایسے عقاید کو افلاطون اور ارسطو کا نام لے کر بیان کرتے ہیں اور اسی طرح علامہ اقبال بھی افلاطون پر تنقید کرتے ہیں۔
(مترجم) یہ درست ہے لیکن افلاطون کی اپنی تصانیف بھی قطعی طور پر ایسے ہی عقاید کی حامل ہیں جیسا کہ خود مصنف کے دوسرے بیانات سے ظاہر ہے۔

ہے ؟ دنیا کی حسین وجمیل اشیاء انسانی دل پر نقش ہو جاتی ہیں اور یہیں سے آرزو کا آغار ہوتا ہیں ۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ حسن وجمال ہی خالق آرزو ہے ۔ پھر علامہ فرماتے ہیں کہ شاعر کا دل حسن وجمال کی جلوہ گاہ ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ وہ فطرت کے حسن میں اضافہ بھی کر سکتا ہے اور حسین شے کو حسین تر شکل میں دیکھ سکتا ہے : ۔

سینۂ شاعر تجلی زار حسن — خیزد از سینای او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوبتر — فطرت از افسون او محبوبتر
بحر و بر پوشیدہ در آب وگلش — صد جہان تازہ مضمر در دلش
در دماغش ، نادمیدہ لالہ ها — ناشنیدہ نغمہ ها ، هم نالہ ها
کاروانها از درایش گام زن — در پی آواز نایش گام زن

اس قوم پر افسوس ہے جو جسمانی اور روحانی تنزل میں متبلا ہوجاتی ہے اور موت وہلاکت کی راہ اختیار کرتی ہے ۔ ایسی ہی قوم کے شاعر زندگی سے روگردانی کرتے ہیں ۔ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جاتے ہیں اور دنیا کو حقیر اور پست سمجھتے ہیں : ۔

وای قومی کز اجل گیرد برات — شاعرش وا بوسد* از ذوق حیات
خوش نمایدزشت را آیئنہ اش — در جگر صد نشتر از نوشینہ اش
بوسۂ او تازگی از گل برد — ذوق پرواز از دل بلبل برد
سست اعصاب تو از افیون او — زندگانی قیمت مضمون او

می رباید ذوق رعنائی ز سرو — جرّہ شاهین از دم سردش تذرو
ماهی و ، از سینہ تا سر آدم است — چون بنات آشیان † اندریم است

---

* وابوسد کے معنی روگردانی کرنا ہے جو بوسیدن کی ضد ہے، جس کے معنی امیدوار ہونے کے ہیں ۔

† بنات آشیاں سے مراد وہ دختران دریائی ہیں جن کا ذکر قدیم یونانی داستانوں میں آتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جزیرے میں مقیم تھیں اُن کے جسم کا آدھا حصہ مچھلی کا سا تھا اور ان کی آواز سخت جاذب ہوتی تھی ۔ جو شخص

از نوا بر ناخدا افسون زند　　کشتیش در قعر دریا افگند
نغمه هایش از دلت دزدد ثبات　　مرگ را از سحر او دانی حیات

یہی فصل تھی جہاں اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں انھوں نے صوفی شعراء پر نکتہ چینی کی تھی، اور حافظ پر سخت حملے کیے تھے، جو اہل ہندوستان کو ناگوار گزرے اور انھوں نے علامہ پر اس سختی سے اعتراضات کیے کہ وہ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں آن اشعار کو حذف کرنے پر مجبور ہوگئے اور صرف اسی پر اکتفا کیا کہ لوگوں کو اس قسم کے شعراء سے متنبہ کریں اور کہیں کہ ایسے شعرا کی پیروی نہ کرو۔

ای زپا افتادہ صہبای او　　صبح تو از مشرق مینای او
آنچنان زار از تن آسانی شدی　　در جہان ننگ مسلمانی شدی
عشق رسوا گشتہ از فریاد تو　　زشت او تمثالش از بہزاد تو
وای بر عشقی کہ نار او فسرد　　در حرم زائید و در بتخانہ مرد

پھر علامہ شاعر سے خطاب کرکے کہتے ہیں کہ اگر تجھے فکر روشن حاصل ہے تو عمل کی طرف قدم بڑھا اور آن مشرقی صوفیانہ افکار کو چھوڑ دے جن کا تو عادی ہوچکا ہے، اور اس جوش و خروش، اور سعی وعمل کی طرف چل جو ابتدائے اسلام میں صحرائی عربوں کا شیوہ تھا اور جس کے بل پر انھوں نے دنیا کو مسخر کر لیا تھا۔

ای میان کیسہات نقد سخن　　بر عیار زندگی او را بزن
فکر روشن بین عمل را رہبراست　　چو درخش برق پیش از تندراست
فکر صالح در ادب میبایدت　　رجعتی سوی عرب میبایدت

سنتا تھا، شیفتہ ہو جاتا تھا اور بے ساختہ ادھر کھنچ جاتا تھا، کشتیبان اپنی کشتی کا رخ آن کی طرف پھیر دیتے اور آخر آن کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیتے تھے۔ یورپ میں انھیں Sirens کہا جاتا ہے۔ لفظ آشیان سے مراد اوقیانوس ہے اردو میں انگریزی لفظ Ocean سے بنا ہے۔

از چمن زار عجم گل چیده ای | نو بهار هند و ایران دیده ای
اندکی از گرمی صحرا بخور | بادۂ دیرینه از خرما بخور
تا شوی در خورد پیکار حیات | جسم و جانت سوزد از نار حیات

اسرار خودی کی نویں فصل '' تربیت خودی '' پر ہے ، علامہ موصوف تربیت خودی میں تین مرحلوں کا ذکر کرتے ھیں - پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے ، دوسرا ضبط نفس کا ، اور تیسرا خلیفۃاللہ ہونے اور نیابت الہی کا - اس سے پہلے وہ نصیحت کر چکے ھیں ، کہ عرب کی طرف لوٹ جاؤ اور صحرا کی گرمی کھاؤ - اس جگہ وہ اونٹ کی زندگی سے تشبیہیں اور استعارے لیتے ھیں جو ریگستان و بیابان میں خاردار جھاڑیاں کھاتا اور سختیاں سہتا ہے اور اپنے صبر و تحمل سے استقلال نفس کا مالک بن جاتا ہے - صحرا میں دوسرے جانوروں سے بڑھ کر اس میں زندگی کے زیادہ مناسبات پائے جاتے ھیں :-

در اطاعت کوش ای غفلت شعار | میشود از جبر پیدا اختیار
ناکس از فرمان پذیری کس شود | آتش ار باشد زطغیان خس شود
هر که تسخیر مه و پروین کند | خویش را زنجیری آیین کند
باد را زندان گل خوشبو کند | قید بو را نافۂ آهو کند
میزند اختر سوی منزل قدم | پیش آیینی سر تسلیم خم
لاله پی هم سوختن قانون او | برجهد اندر رگ او خون او
قطره ها دریاست از آیین وصل | ذره ها صحراست از آیین وصل
باطن هر شی ز آیینی قوی | تو چرا غافل ازین سامان روی
باز ای آزاد دستور قدیم | زینت پا کن همان زنجیر سیم
شکوه سنج سختی آیین مشو | از حدود مصطفی بیرون مرو

خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں احکام الٰہی اور قانون محمدی کی اطاعت کرنی چاہئے تاکہ اس جبر اور پابندی کی راہ سے ہم حریت کی طرف جائیں اور صاحب اختیار ہو جائیں : ۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ زمام نفس کو تھام لے کیونکہ اگر تیرا اپنا فرمان تجھ پہ جاری نہیں تو دوسرے تجھ پہ حکم چلائیں گے : ۔

هر که برخود نیست فرمانش روان — میشود فرمان پذیر از دیگران
طرح تعمیر نو از گل ریختند — با محبت خوف را آمیختند
خوف دنیا، خوف عقبی، خوف جان — خوف آلام زمین و آسمان
حب، مال و دولت و حب وطن — حب خویش و اقربا و حب زن
تاعصای لا اله داری بدست — هر طلسم خوف را خواهی شکست
هر که حق باشد چو جان اندر تنش — خم نگردو پیش باطل گردنش
خوف را در سینهٔ آو راه نیست — خاطرش مرعوب غیرالله نیست
هر که در اقلیم لا آباد شد — فارغ از بند زن و اولاد شد
میکند از ما سوا قطع نظر — می نهد ساطور بر حلق پسر
بایکی مثل هجوم لشکر است — جاں بچشم او ز باد ارزان تراست
این همه اسباب استحکام تست — پخته ای محکم اگر اسلام تست

اس جگہ پہنچ کر انسان تیسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے جو نیابت الٰہی کا مرحلہ ہے اور سایۂ خدا بن جاتا ہے ۔

نائب حق درمیان بودن خوش است — بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائب حق همچو جان عالم است — هستی آو ظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگه بود — در جهان قائم با مرالله بود
خیمه چو در وسعت عالم زند — این بساط کهنه را برهم زند
فطرتش معمور و می خواهد نمود — عالم دیگر بیارد در وجود

صد جهان مثل جهان جزو و کل   روید از کشت خیال او چو گل
پخته سازد فطرت هر خام را   از حرم بیرون کند اصنام را
نغمه زا تار وی از مضراب او   بهر حق بیداری او ، خواب او
شیب را آموزد آهنگ شباب   می دهد هر چیز را رنگ شباب
نوع انسان را بشیر وهم نذیر   هم سپاهی، هم سپه گر، هم امیر
چون عنان گیرد بدست آن شهسوار   تیز تر گردد سمند روزگار
خشک سازد هیبت او نیل را   میبرد از مصر اسرائیل را
از قم او خیزد اندر گور تن   مرده جانها چون صنوبر در چمن
زندگی را می دهد تغییر نو   می دهد این خواب را تعمیر نو

هستی مکنون او راز حیات
نغمۂ نشنیدۂ ساز حیات

ایسا ہی انسان نوع بشر کا ’ قائد اور پیشوا ہوتا ہے ‘ انسانوں کو چاہیے کہ اس کے پیچھے چلیں اور بے چون و چرا اس کے پیش کیے ہوئے دستوروں پر عمل پیرا ہوں :-

ای سوار اشهب دوران بیا   ای فروغ دیدۂ امکان بیا
رونق هنگامۂ ایجاد شو   در سواد دیده ها آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن   نغمۂ خود را بهشت گوش کن
خیر و قانون اخوت ساز ده   جام صهبای محبت باز ده
ریخت از جور خزان برگ شجر   چون بهاران بر بهار ما گزر
سجده های طفلک و برنا و پیر   از جبین شرمسار ما بگیر

از وجود تو سر افراز یم ما
پس بسوز این جهان سازیم ما

یہاں ضمناً ایک چیز کی وضاحت کر دینی چاہیے - جو لوگ الٰہییات اور فلسفۂ اسلامی سے واقف ہیں ،جانتے ہیں کہ یہ خیال اور فلسفۂ علامہ اقبال کوئی نئی چیز نہیں - الٰہییات کے ماہر قدیم زمانے سے ہی اس بات کے متعقد تھے کہ نفس عاملہ عالی ترین اور شریف ترین شے ہے جو اس کائنات میں موجود ہے - اس نفس عاملہ کی نشو ونما ضروری ہے تاکہ بالتدریج اوج کمال کو پہنچ جائے، حکماء کہتے تھے کہ خلقت کے مختلف ارکان (جمادات ، بناتات اور حیوانات سب کے سب) ہمیشہ ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتے رہتے ہیں اور آن میں سے ہر ایک اطاعت کی راہ سے ترقی کے زینے پر چڑھے جاتا ہے یہاں تک اپنے مقام پہ پہنچ جاتے ہیں -

ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ ارکان مختلف ارکان نہیں بلکہ ایک ہی وجود کی مختلف حالتیں ہیں - ان حالتوں میں سب سے کرخت اور کثیف حالت جمادی کی ہے - ضروری ہے کہ وجود سے حالت لطیف ہو تاکہ وجود اس لطیف تر حالت کی طرف چل سکے - یہ لطیف تر حالت حالت نباتی ہے - نبادات ، جمادات سے اطاعت و بندگی کی طالب ہوتی ہیں ، جو جمادات ، نباتات کی مطیع ہوجاتی ہیں ، اطاعت کا صلہ پاتی ہیں اور وہ صلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نباتات کے درجے پر پہنچ جاتی ہے اور آن میں شکل ، بو اور لذت آجاتی ہے اور پھر آن میں نشو نما پانے ، اور پھلنے پھولنے کی قوت آجاتی ہے - اسی طرح ایک دوسری حالت اور دوسرا درجہ بھی ہوتا ہے جو حیوانات کا ہے ، حیوان بھی نباتات سے طاعت و اطاعت کا طالب ہوتا ہے اور جو نبات حیوان کی اطاعت کرتی ہے وہ اپنی بندگی اور اطاعت کا صلہ پاتی ہے اور حیوانات کے درجے پر پہنچ جاتی ہے - جب تک وہ نباتات کے مرحلے پر رہتی ہے اس میں نمو کی حرکت ہوتی ہے - وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل نہیں ہوسکتی اور اس میں ارادہ بھی نہیں ہوتا - جونہی کہ نبات ، حیوان میں بدلتی ہے حرکت انتقال اور حرکت ارادی

کی حامل بن جاتی ہے - جو نبات ترقی نہیں کرتی اسی حالت نباتی میں رہ جاتی ہے اور عذاب اور عقوبت کی مستوجب ہوتی ہے - علی ھذا القیاس عالم حیوانی سے بھی اوپر اور بلند ایک اور درجہ ہے ، اور وہ ایک ایسا وجود ہے کہ جو حرکت انتقالی اور حرکت ارادی کے علاوہ ایک اور قوت بھی رکھتا ہے جو دوسرے طبقات کے قوای سے بالا تر ہوتی ہے اور وہ قوۃ عقل ہے - یہ وجود انسان ہے ، انسان حیوانات سے بھی اطاعت کا طالب ہوتا ہے جو حیوان اطاعت نہیں کرتا تکلیف اٹھاتا ہے اور حیوانی حالت ہی میں رہتا ہے - جو حیوانات آدمی کی اطاعت کرتے ہیں اطاعت کا اجر پاتے ہیں - اور حیوانی درجے سے ترقی کرکے انسانی درجے پر پہنچ جاتے ہیں ، انسان تمام موجودات یعنی جمادات نباتات ، اور حیوانات کا بادشاہ ہے اور تمام عالم پر مسلط ہے اور ہر شے کو مسخر کر سکتا ہے - لیکن ہم نے ابھی کہا تھا کہ نفس عاقلہ ، کائنات کی عالی ترین اور شریف ترین حاصل ہے اور ہم نے ثابت کیا تھا کہ انسان سے نیچے کوئی پست درجہ کی شے ضائع نہیں ہوتی ان معنوں میں کہ ہر ایک شے کے مقابلے ایک بلند درجہ موجود ہوتا ہے جہاں ترقی کرکے یہ شے پہنچ سکتی ہے اور بہترین بن سکتی ہے ، اگر پست اور کرخت درجے ضائع نہیں ہو سکتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ نفس عاقلہ اپنی بلندی اور شرافت کے باوجود ضائع ہو جائے - پس اس سے بھی بلند تر ایک درجہ ہے جہاں انسان پہنچ سکتا ہے ، وہ درجہ انسان سے اطاعت وطاعت کا خواہاں ہے بعض انسان اس اطاعت سے روگردانی کرتے ہیں اور معصیت کا شکار ہوتے ہے اس بنا پر انہیں عقوبت پہنچتی ہے اور وہ عقوبت یہ ہے کہ وہ انسانی درجے پر ہی رہتے ہیں - لیکن جو لوگ طاعت واطاعت کرتے ہیں ، ثواب پاتے ہیں ، اور جس طرح پست درجوں میں اطاعت کا ثواب یا صلہ یہ ہوتا ہے کہ ہر وجود اپنے سے بلند تر درجے کی طرف ترقی کرتا ہے (یعنی جمادات سے نباتات ، نباتات سے

حیوانات اور حیوانات سے انسان بنتا ہے) ناچار انسان بھی اپنے صانع کی اطاعت و طاعت سے آدمی کے درجے سے ترقی کرکے صانع تک پہنچتا ہے۔ صانع عالم نے بنی نوع انسان کو اس کائنات کا بادشاہ بنایا ہے اور زمین پر اس کو اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ اگر انسان اپنی علمی اور عملی قوتوں کو بروے کار لائے اور اپنے خدا کی اطاعت و بندگی کرے تو اس کا نفس عاقلہ صانع عالم کے ملک باطن پر بھی بادشاہ ہو جائے۔ *

یہ وہی مطالب ہیں جو مولوی رومی نے اپنی مثنوی میں بیان کیے ہے اور بار بار آن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان اشعار میں سے یہ اشعار معروف ہیں :۔

از جمادی مردم و نامی شدم　　و ز نما مردم بحیوان سر زدم

وغیرہ وغیرہ اور اسی طرح ایک اور موضوع کے سلسلے میں یہ اشعار :۔

آمدہ اول با قلیم جماد　　و ز جمادی در نباتی او فتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد　　و ز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چون بحیوانی فتاد　　نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہمیں میلی کہ داردسوی آن　　خاصہ در وقت بہار و ضیمران
ہمچو میل کودکان با مادران　　سر میل خود نداند در لبان
بازاز حیوان سوی انسانیش　　میکشید آن خالقی کہ دانیش
ہمچنین اقلیم تا اقلیم رفت　　تا شد اکنون عاقل و دانا و رفت
عقلہای اولینش یاد نیست　　ہم ازین عقلش تحول کرد نیست

تا دہد زین عقل پر حرص و طلب
صد ہزاران عقل بیند بو العجب

---

* اس خیال کی بنیاد حکیم اوریگینس کے عقیدے پر ہے جو تیسری صدی عیسوی کا فلسفی ہے۔ فلوطینس اور فرفوریوس نے بھی اسی عقیدے کو اپنایا تھا۔ وہیں سے مسلمانوں میں آیا۔ حکیم ناصر خسرو نے اپنی کتاب ,, زادالمسافرین ،، میں انہی مطالب کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ میرا بیان وہیں سے ماخوذ ہے۔

علامه اقبال مولانائے روم کے شاگرد اور پیرو ہیں، انھوں نے تمام حکمائے اسلام کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، انہی کے خیالات اور مفہوم کو وہ اسرار خودی میں نئے انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس انسان کامل کا جن کی تعریف میں تمام عرفا اور متصوفین رطب اللسان ہیں اور لفظ پیر سے خطاب کرتے ہیں یوں ذکر کرتے ہیں۔

هر که در آفاق گردد بو تراب — باز گرداند ز مغرب آفتاب
از خود آگاهی ید اللهی کند — از ید اللهی شهنشاهی کند

اور پھر انسان کو یوں تعلیم دیتے ہیں :—

سنگ شوای همچو گل نازک بدن — تا شوی بنیاد دیوار چمن
از گل خود آدمی تعمیر کن — آدمی را عالمی تعمیر کن
ناله و فریاد و ماتم تا کجا؟ — سینه کوبیهای پیهم تا کجا؟
در عمل پوشیده مضمون حیات — لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جهان تازه شو — شعله در بر کن، خلیل آوازه شو
با جهانِ نامساعد ساختن — هست در میدان سپر انداختن

مرد خود داری که باشد پخته کار — با مزاج او بسازد روزگار
گر نسازد با مزاج او جهان — میشود جنگ آزما با آسمان
بر کند بنیاد موجودات را — میدهد ترکیب نو ذرات را
گردش ایام را برهم زند — چرخ نیلی فام را برهم زند
میکند از قوت خود آشکار — روزگار نو که باشد سازگار
در جهان نتوان اگر مردانه زیست — همچو مردان جان سپردن زندگیست
ای ز آداب امانت بیخبر! — از دو عالم خویش را بهتر شمر
از رموز زندگی آگاه شو — ظالم و جاهل ز غیر الله شو
چشم و گوش و لب کُشا ای هوشمند — گر نبینی راه حق، بر من بخند

فارغ از اندیشهٔ اغیار شو　　قوت خوابیده ای، بیدار شو
سنگ چون بر خود گمان شیشه کرد　　شیشه گردید و شکستن پیشه کرد
خویش را چون از خودی محکم کنی　　تو اگر خواهی جهان برهم کنی
گر فنا خواهی ز خود آزاد شو　　گر بقا خواهی بخود آباد شو
از خودی اندیش و مرد کار شو
مرد حق شو، حامل اسرار شو

آپ نے دیکھا کہ علامہ موصوف ہمیشہ سعی و عمل کی ترغیب و تلقین کرتے ہیں، اور کاہلی، سستی نفس، عزلت گزینی اور تقدیر کے آگے سر جھکا دینے سے روکتے ہیں، یہاں تک کہ وہ تقدیر کو بھی انسان ہی کے دست قدرت کا کرشمہ سمجھتے ہیں، ان معنوں میں کہ انسان خدا سے دوسری تقدیر کا مطالبہ کر سکتا ہے اور جو کچھ مقدر ہو چکا ہو اسے بدلوا سکتا ہے۔ ''ضرب کلیم'' میں اُن کا ایک اُردو شعر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ نباتات، جمادات تو اسیر تقدیر ہیں لیکن مومن فقط احکام الٰہی کا پابند ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں کرۂ مریخ کے ایک حکیم کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

گر زیک تقدیر خون گردد جگر　　خواہ از حق حکم تقدیر دگر
تو اگر تقدیر نو خواہی رواست　　زانکه تقدیرات حق لا انتہاست
ارضیان نقد خودی درباختند　　نکتهٔ تقدیر را نشناختند
رمز باریکش بحرفی مضمر است　　تو اگر دیگر شوی، او دیگر است
خاک شو، نذر ہوا سازد ترا　　سنگ، شو بر شیشه اندازد ترا
تا بخود نا ساختن ایمان تست　　عالم افکار تو زندان تست
نوع دیگر بین جہان دیگر شود　　این زمین و آسمان دیگر شود

''جاوید نامہ'' میں ایک اور جگہ حلاّج کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

جو کچھ بزرگوں اور صاحب همت لوگوں نے جبر و تقدیر کا مفہوم سمجھا تھا وہ هم کمزور انسانوں کے تصور سے مختلف تھا ، جس پر هم نے تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کیا هؤا ھے۔

جبر خالد عالمی برهم زند | جبر ما بیخ و بن ما بر کند
کار مردان است تسلیم و رضا | بر ضعیفان راست ناید این قبا
کار ما غیر از امید و بیم نیست | هر کسی را همت تسلیم نیست
ای که گوئی ، بودنی این بود ، شد | کار ها پابند آیین بود ، شد
معنی تقدیر کم فهمیده ای | نی خودی را نی خدا را دیده ای
مرد مومن با خدا دارد نیاز | با تو ما سازیم تو با ما بساز
عزم او خلاق تقدیر حق است | روز هیجا تیر او تیر حق است

اور پھر "اسرار خودی" میں بیان کرتے هیں کہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو تقدیر کا مقید کر لیا ھے وہ غلامانہ فطرت رکھتے هیں۔ آزاد وہ ھے جو حالات کو خود وضع کرتا ھے ، عبد جو کچھ زندگی میں پیش آئے اس پر سر جھکاتا ھے اور حر هر لحظہ ایک نئی چیز پیدا کرتا ھے :-

عبد را تحصیل حاصل فطرت است | واردات جان او بی قدرت است
دم بدم نو آفرینی کار حر | نغمہ پی هم تازہ ریزد تار حر
فطرتش زحمت کش تکرار نیست | جادۂ او حلقۂ پرکار نیست
عبد را ایام زنجیر است و بس | بر لب او حرف تقدیر است و بس
همت حر با قضا گردد مشیر | حادثات از دست او صورت پذیر

ایک اور جگہ فرماتے هیں کہ آدمی کو چاهیے کہ اپنے آپ سے مایوس نہو اور اپنے آپ کو حقارت سے نہ دیکھے ، انسان میں ، قوت نظر ، مشاهدہ ،

دقّت بینی ، بصیرت اور تبحّر و تعمق ودیعت کیا گیا ہے تاکہ وہ فطرت کا نظارہ کرے اور اُسے معلوم ہو سکے کہ پہنائے کائنات میں اُس کے سوا اور کوئی شے نہیں :-

بیا با شاهد فطرت نظر باز　　چرا در گوشهٔ خلوت نشینی
ترا حق داد چشم پاک بینی　　که از نورش نگاهی آفرینی

ضمیر کن فکان غیر از تو کس نیست　　نشان بی نشان غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نه در ره زیست　　به پهنای جهان غیر از تو کس نیست

یہاں تک کہ ماہ نو بھی اپنی لاغری اور کمزوری کے باوجود اتنی قوت رکھتا ہے کہ راہ کمال کے مختلف مدارج طے کرکے رفتہ رفتہ ماہ تمام بن جائے ۔

بہر حال جو کچھ کسی سے بن پڑے سعی و عمل سے کام لے :-

سحر در شاخسارے بوستانی　　چه خوش میگفت مرغ نغمه خوانی
بر آور هر چه اندر سینه داری　　سرودی ناله ای ، آهی ، فغانی

اگر تجھے شبنم بنایا گیا ہے تو برگ گل پر ٹپک ، اگر کانٹا ہے تو اپنی خلش کو جاری رکھ ، اگر تو بت پرست اور کافر ہے تو بتخانہ اور زنار کے شایان شان ہو جا ، اپنے آپ میں ڈوب جا اور شراب تلخ کی طرح ابھر کر دلوں کو گرما دے :-

دانهٔ سبحه به زنار کشیدن آموز
گر نگاه تو دو بین است ندیدن آموز
باز خلوت کدهٔ غنچه برون زن چو شمیم
با نسیم سحر آمیز و وزیدن آموز
آفریدند اگر شبنم بی مایه ترا
خیز و بر داغ دل لاله چکیدن آموز

اگرت خار گل تازہ رسی ساختہ اند
پاس ناموس چمن دار و خلیدن آموز
باغبان گر ز خیابان تو یر کند ترا
صفت سبزہ دگر بارہ دمیدن آموز
تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آیی بیرون
عزلت خمکدہ ای گیر و رسیدن آموز

اور جو لوگ یہ کہتے ھیں کہ یہ جہان فانی ھے اور انسانی زندگی ایک لمحے سے زیادہ نہیں اور اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں، ان سے خطاب کرتے ھیں :-

جہان ما ھمہ خاک است و پی سپر گردد
ندانم اینکہ نفسہای رفتہ بر گردد
نگاہ شوق و خیال بلند و ذوق وجود
مترس از اینکہ ھمہ خاک رھگذر گردد
چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ مدام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

علامہ اقبال کے فلسفیانہ تعلیمات اور اجتماعی افکار کے بنیادی اصول ''اسرار خودی'' اور '' رموزبےخودی'' میں درج ھیں، جیسا کہ ھم نے دیکھا اول الذکر کتاب میں وہ فرماتے ھیں کہ اپنے آپ کو پہنچان لے اور پالے، دوسری کتاب کا موضوع یہ ھے کہ جب تونے اپنی خودی کو پالیا تو پھر اپنے آپ کو ملت میں کھو دے۔ وہ فرماتے ھیں کہ ایک مرد مسلمان کی ملت خود جمعیت اسلام ھے نہ کہ یہ مملکت اور وہ مملکت اور بےخودی (یعنی اپنی خودی کو جمعیت اسلامی میں گم کر دینا) بھی درحقیقت نفس کی تربیت، تہذیب اور وسعت اور نشو و نما ھی کے مختلف مرحلوں میں سے ایک مرحلہ ھے۔ غرض یہاں خودی سے مراد نفس ملی

اور جمعیت اسلامی کی خودی ہے ، اور وہاں شخصی خودی اور انفرادی تشخص و تعین مقصود ہے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں اخوت اسلامی کی واحد جمیعت قائم ہو، جو آزاد اور غیر محکوم ہو ، اور اس کے اجزا کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے والا رشتہ عشق خدا اور ایمان بہ پیغمبر ہو ، اور اس کا مرکز کعبہ ہو ۔ علامہ اپنے مطالب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ فرد کو ملت سے وابستہ ہونا چاہیے ، ملت افراد ہی کے اختلاط سے وجود میں آتی ہے ، اور ملت کا ارتباط دو رکن سے ہوتا ہے ، توحید اور نبوت ۔ یاس ، خوف ، اور حزن ، قاطع حیات ہیں اور ان سب کا ازالہ توحید سے ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا جس نے ہمیں توحید کے راز سے آگاہ کیا ۔ ہم اس کے احکام کی پیروی سے باہم متحد ہوگئے۔ ان کی رسالت کا مقصد یہ تھا کہ بنی آدم میں حریت ، مساوات اور اخوت کی بنیاد قائم ہو ۔ دین ملت محمدی مکان و زمان سے بالا ہیں ، اور وطن اساس ملت نہیں ، ملت کا نظام آئین سے ہوتا ہے ۔ ملت محمدی کا آئین قرآن ہے ۔ اس انحطاط کے دور میں ہمارے لیے یہی بہترین صورت ہے کہ ہم سابقین کا اقتدا اور تقلید کریں ، اور اجتہاد کا دعویٰ نہ کریں ، سیرت ملی کی پختگی کا انحصار آئین الٰہی کا اتباع ہے ۔ سیرت ملی کے حسن کا دارومدار آداب محمدی کی پیروی پر ہے ۔ حیات ملی ایک ظاہری مرکز کی محتاج ہوتی ہے ۔ مرکز ملت اسلامی مکہ ہے ۔ اس امت کا مقصد توحید کی حفاظت اور اشاعت ہونا چاہیے ۔ حیات ملی کی وسعت قوای نظام عالم کی تسخیر ہے اور یہیں حیات ملت کی تکمیل ہوتی ہے کہ ملت میں فرد کی طرح احساس خودی پیدا ہوتا ہے ۔ روایات ملی کی تدوین اور تاریخ گزشتہ کا تتبع اس احساس کی تکمیل کا باعث بنتا ہے ۔

بقای نوع کا ظہور ازدواج اور اموست سے ہوتا ہے۔ چونکہ ہم سابقہ صفحات میں ''رموز بیخودی'' کے بہت سے اشعار نقل کر چکے ہیں اس لیے یہاں صرف پڑھنے والوں کے لیے چند متفرق اشعار درج کرتے ہیں :-

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامۂ احرار باش
حرز جان کن گفتۂ خیر البشر — ہست شیطان از جماعت دور تر
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می گیرد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
در دلش ذوق نمو از ملت است — احتساب کار او از ملت است
پختہ تر از گرمی صحبت شود — تا بمعنی فرد ہم ملت شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است
فطرتش وارفتۂ یکتائی است *
حفظ او از انجمن آرائی است

در جہان کیف و کم گردید عقل — پی بمنزل برد از توحید عقل
ملت از یک رنگی دلہاستی — روشن از یک جلوۂ سیناستی
قوم را اندیشہ ہا باید یکی — در ضمیرش مدعا باید یکی
جذبہ باید در سرشت اویکی — ہم عیار خوب و زشت اویکی
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ — باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
بر نسب نازان شدن نادانی است — حکم او اندر تن و تن فانی است
مرگ را ساماں ز قطع آرزوست — زندگانی محکم از لاتقنطو است
حق تعالیٰ پیکر ما آفرید — وز رسالت درتن ما جان دمید
جوہر ما با مقامی بستہ نیست — بادۂ تندش بجامی بستہ نیست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم ما بجز اسلام نیست

* یعنی تنہا رہنے سے وہ انحطاط کا شکا ہوجاتا ہے (مصنف)

مسلم استی دل باقلیمی مبند — گم مشو اندر جهان چون و چند
دل بدست آور که در پهنای دل — میشود گم این سرای آب و گل
تا وطن را شمع محفل ساختند — نوع انسان را قبائل ساختند
روح از تن رفت و هفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقدام ماند

ملتی را رفت چون آئین ز دست
مثل خاک اجزای او از هم گسست

گر تو میخوای مسلمان زیستن — نیست ممکن جز به قرآن زیستن
صوفی پشمینه پوش حال مست — از شراب نغمهٔ قوال مست
آتش شعر عراقی در دلش — در نمیسازد بقرآن محفلش
از کلاه و بوریا، تاج و سریر — فقر او از خانقاهان باج گیر
واعظ دستان زن افسانه بند — معنی او پست و حرف او بلند

از خطیب و دیلمی گفتار او
با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

مضمحل گردد چو تقویم حیات — ملت از تقلید می گیرد نبات
راه آبا رو که این جمعیت است — معنی تقلید ضبط ملت است
بحر گم کردی زیان اندیش باش — حافظ جوی کم آب خویش باش

از یک آئینی مسلمان زنده است
پیکر ملت ز قرآن زنده است

اجتهاد اندر زبان انحطاط — قوم را برهم همی پیچد بساط
ز اجتهاد عالمان کم نظر — اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
طینت پاک مسلمان گوهر است — آب و تابش از یم پیغمبر است

عبرتی ای مسلم روشن ضمیر — از مآل اُمت موسیٰ بگیر
داد چون آن قوم مرکز را زدست — رشته و جمعیت ملت گسست

ما سوا از بهر تسخیر است و بس
سینهٔ او عرصهٔ تیر است و بس

چیست تاریخ ، ای ز خود بیگانه ای — داستانی ، قصه ای ، افسانه ای ؟
این ترا از خویشتن آگه کند — آشنای کار و مرد ره کند
همچو خنجر برفسانت می زند — باز بر روی جهانت می زند
شعلهٔ افسرده در سوزش نگر — دوش در آغوش امروزش نگر
شمع او بخت امم را کوکبست — روشن از وی امشب و هم دیشبست
چشم پرکاری که بیند رفته را — پیش تو باز آفریند رفته را
ضبط کن تاریخ را پاینده شو — از نفسهای رمیده زنده شو
دوش را پیوند با امروز کن — زندگی را مرغ دست آموز کن
سر زند از ماضی تو حال تو — خیز د از حال تو استقبال تو
مشکن ، ار خواهی حیات لازوال — رشتهٔ ماضی ز استقبال و حال
موج ادراک تسلسل زندگیست — میکشان را شور قلقل زندگیست
نغمه خیز از زخمهٔ زن ساز مرد — از نیاز او دوبالا ناز مرد
پوشش عریانی مردان زنست — حسن دلجو عشق را پیراهنست
عشق حق پروردهٔ آغوش او — این نوا از زخمهٔ خاموش او
آنکه نازد بر وجودش کائنات — ذکر اوفرمود باطیب و صلات*

---

* آنحضرت کا ارشاد ہے کہ مجھے تین چیزیں بہت مرغوب ہیں - عورت، خوشبو اور نماز -

مسلمی کو را پرستاری شمرد　　بهره ای از حکمت قرآن نبرد
گفت آن مقصود حرف کن فکان　　" زیر پای امهات آمد جنان "
قوم را سرمایه ای صاحب نظر　　نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او فرزندهای تندرست　　تردماغ وسخت کوش وچاق وچست

حافظ رمز اخوت مادران
قوّت قرآن و ملت مادران

اسلامی اخوت، مساوات اور حریت کے سلسلے میں وہ ایک حکایت نقل کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون اسلام میں حقوق کے لحاظ سے شاہ و گدا میں کوئی فرق نہیں۔ سلطان مراد شاہ کے حکم سے ایک معمار ایک مسجد بناتا ہے۔ مسجد بادشاہ کو پسند نہیں آتی وہ اس معمار کے ہاتھ کٹوا دیتا ہے۔ معمار قاضی کے پاس شکایت لے جاتا ہے۔ قاضی سلطان کو اپنے حضور میں بلا کر قصاص کا حکم دیتا ہے :-

گفت قاضی فی القصاص آمد حیات　　زندگی گیرد باین قانون ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست　　خون شه رنگین تر از معمار نیست
پیش قرآن بنده و مولا یکی است　　بوریا و مسند دیبا یکی است

پیام مشرق میں بھی ایک قطعہ اسی مضمون کا ہے کہ آدمی کو کسی کے آگے سر نہیں جھکانا چاہیے۔ جو شخصی بندگی کرتا ہے کتے سے بدتر ہے :-

آدم از بی بصری بندگی آدم کرد
گوهری داشت ولی نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوی غلامی ز سگان خوار تر است
من ندیدم که سگی پیش سگی سر خم کرد

یہاں علامہ اقبال کی دوسری کتابوں کا مختصراً ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ''جاوید نامہ'' جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ ہوچکا ہے، ایک داستان ہے جس میں وہ افلاک کی سیر کرتے ہیں اور گزشتگان کی ارواح سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ کتاب ڈانٹے کی تصنیف ''طربیۂ خداوندی *'' اور معری کی تصنیف '' رسالۃ الغفران'' وغیرہ کے طرز پر ہے۔ اس کا آغاز ان دو شعروں سے ہوتا ہے

خیال من بہ تماشای آسمان بود است
بدوش ماہ و بآغوش کہکشان بودہ است
گماں مبر کہ ہمین خاکدان نشیمن است
کرہرستارہ جہان است یا جہان بودہ است

ایک حکایت لکھتے ہیں کہ ایک رات میں سمندر کے کنارے بیٹھا محو تفکر تھا اور دل ہی دل میں مولانا روم کی یہ غزل پڑھ رہا تھا :-

زین ہم رہان سست عناصر د لم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

اچانک رومی کی روح آشکار ہوئی، میں نے اس سے کئی ایک سوالات پوچھے اور انھوں نے میرے مشکلات کا حل بیان کیا اور پھر فرمایا کہ ان نو آسمانوں سے خائف نہ ہو، زمان و مکان بھی تیری روح کی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔ اس کے بعد زروان جو زمان و مکان کی روح ہے، مجھے عالم بالا میں لے گئی۔

اس سیر روحانی کی داستان میں وہ اپنے آپ کو زندہ رود کے نام سے پکارتے ہیں، اور ہر جگہ ان کے رفیق راہ اور رہنما مولوی رومی ہیں جو طرح طرح کے حالات بیان کرتے جاتے ہیں۔ فلک قمر میں وہ عارفان

* Divina Commedia

ہندوستان میں سے ایک کو جو ''جہان دوست'' کے نام سے مشہور ہیں، ملتے ہیں، اسی طرح وادی برغمید میں چار طاسین نبوت کو دیکھتے ہیں۔ پہلی طاسین گوتم یعنی مہاتما بدھ دوسری طاسین زرتشت، تیسری طاسین مسیحؑ چوتھی طاسین محمدؐ ہے، ٹالسٹائی کے خواب میں جو طاسین مسیحؑ ہے دختر فرنگی * یہودا † اسخریوطی سے جو رود سیماب میں تیر رہا ہے، خطاب کرتی ہے کہ تونے روح القدس کی قیمت کو نہ پہچانا ۔ اور وہ جواب دیتا ہے کہ تمہارا جرم میرے جرم سے زیادہ سنگین ہے:-

عشق از سوداگری‌های تو خوار عقل و دین از کافری های تو خوار
با تو غیر از فکر چنگیزی نداد حکمتی کو عقدۂ اشیا کشاد

فلک عطارد میں جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی روحیں ظاہر ہوتی ہیں اور مولوی اور زندہ رود سے دیر تک بحث وگفتگو کرتی ہیں، سید جمال الدین، خلافت آدم، حکومت الٰہی، منافع علم وحکمت کی تشریح کرتے ہیں اور روسی قوم کے نام پیغام بھیجتے ہیں۔ فلک زہرہ میں وہ قدیم اقوام کے خداؤں کی محفل کو جنھیں اہل فرنگ نے تازہ زندگی عطا کی ہے، دیکھتے ہیں۔ انہیں کچنر‡ اور فرعون کی روحیں عذاب میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ کچنر عذر پیش کرتا ہے کہ

از پی لعل و گہر گوری نکند مقصد قوم فرنگ آمد بلند
میتوان دیدن ز آثار قدیم سرگزشت مصر و فرعون و کلیم

علم و حکمت کشف اسرار است و بس
حکمت بی جستجو خوار است و بس

---

* مراد یورپ اور یورپین لوگ ہیں (مصنف)

† حضرت عیسیٰؑ کا وہ حواری جس نے اپنے آقا کے ساتھ غداری کی تھی اور دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ (مصنف)

‡ Kitchener سوڈان کا حاکم اور مصر میں انگریزی فوجوں کا سردار، جس نے افریقہ میں بوئروں کے ساتھ جنگ کی، ترقی کر کے فیلڈ مارشل اور وزیر جنگ کے عہدے پر فائز ہوا (مصنف)

فرعون کہتا ہے ، میں نے مانا کہ تم لوگوں نے میری قبر کو تاریخی اکتشافات کے لیے کھودا لیکن تربت مہدی سوڈانی میں کیا بات تھی ؟ فلک مریخ میں علامہ دیکھتے ہیں کہ ایک دوشیزہ دعوائے رسالت کرتی ہے اور اہل مریخ میں سے ایک فلسفی بیان کرتا ہے کہ اس لڑکی کو فرز مرز (جو ابلیس کے ساتھیوں اور مددگاروں میں سے ہے) یورپ کی سرزمین سے چرا کر یہاں لایا ہے ۔ یہ لڑکی واہی تباہی باتیں کرتی ہے جنھیں اہل یورپ کے اقوال کی نظیر کہنا چاہیے ۔ اس کے خطبات میں ایک خطبہ یہ ہے :۔

ای زنان، ای خواهران، ای مادران — زیستن تاکی مثال دلبران
دلبری اندر جهان مظلومی است — دلبری محکومی و محرومی است
مرد صیادی بنخچیری کند — گرد تو گردد که زنجیری کند
خودگذاریهای او ، مکر و فریب — درد و داغ و آرزو ، مکر و فریب
گرچه آن کافر حرم سازد ترا — مبتلای درد و غم سازد ترا
همبر او بودن آزار حیات — وصل او زهر و فراق او نبات
از اموست زرد روی مادران — ای خنک آزادی بی شوهران

ظاہر ہے کہ اقبال اس طرح کی باتوں کے خلاف ہیں ۔ فلک مشتری میں تین روحیں اُن کے سامنے آتی ہیں جنھوں نے بہشت کے ٹھکانے کی خواہش نہ کی اور جاودانی سرگردانی کی طرف مائل ہوئیں ، اُن میں سے ایک حلاج ہیں ، دوسرے غالب کاشمیری* اور تیسرے طاهره قرة العین اُن میں سے ہر ایک ، ایک غزل پڑھتا ہے ، حلاج کہتا ہے :۔

زخاک خویش طلب آتشی که پیدا نیست
تجلّی دگری در خورِ تقاضا نیست

---

* پھر وہی اشتباہ

یہ غزل خود علامہ مرحوم کی ہے ۔ غالب اپنی غزل پڑھتا ہے جس کا مطلع ہے :۔

بیا کہ قاعدہ آسمان بگر دانیم　　قضا بگر دش رطل گران بگردانیم

اور طاہرہ (جو کلام اقبال میں '' خاتون عجم '' کے نام مذکور ہے) اپنی یہ مشہور غزل پڑھتی ہے :۔

گربتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ روبرو　　شرح دہم غم ترانکتہ بہ نکتہ مو بمو

زندہ رود ، اُن میں سے ہر ایک سے کسی نہ کسی مشکل مسئلے کی وضاحت چاہتے ہیں ۔ اور وہ جواب دیتے ہیں ۔ ابھی وہ اس گفتگو سے فارغ نہیں ہوتے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا تاریک ہوگئی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابلیس آ جاتا ہے ۔ اس ملاقات کا بیان اور ابلیس کی گفتار پڑھنے اور سننے کے قابل ہے ۔ وہ متعدد اشارات جو اقبال اپنی مختلف کتابوں شیطان کے بارے میں کرتے ہیں ، سب کے سب خاص پہلو رکھتے ہیں مثلاً یہ شعر جو خدا سے خطاب کرکے کہا گیا ہے :۔

جرم ما از دانہ ای ، تقصیر او از سجدہ ای

نی بہ آن بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

فلک زحل میں روح ہندوستان ظاہر ہوتی ہے اور اُن تمام غداروں کا جو اس کی محکومی کا باعث ہوئے ہیں ، شکوہ کرتی ہے ۔ اور افلاک کے اُس طرف جنت میں پہنچنے سے پہلے وہ جرمن فلسفی نٹشے کی روح کو دیکھتی ہے وہ روح دونوں جہان کے درمیان ہے اور اس کی عقل اپنے آپ سے باتیں کرتی ہے ۔ بہشت بریں میں قصر شرف النسا بیگم، دختر خان بہادر خان ، حاکم پنجاب کو دیکھتے ہیں اور پھر سید علی ہمدانی ، امیر کشمیر ، سے پوچھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان نیک عمل کریں تو پھر اس

نے شیطان کو کیوں پیدا کیا کہ جو ہماری نظروں میں زشت و بد کو یوں آراستہ کرکے لاتا ہے ؟ وہ جواب دیتے ہیں :-

بندۂ کز خویشتن دارد خبر — آفریند منفعت را از ضرر
بزم با دیواست آدم را وبال — رزم با دیواست آدم را جمال
خویش را بر اہرمن باید زدن — تو ہمہ تیغ ، آن ہمہ سنگ فسن

اس کے بعد وہ ملا طاہر غنی کاشمیری اور بھرتری ہری سے باتیں کرتے ہیں - پھر وہ سلاطین مشرق کے محل میں نادر شاہ افشار ، سلطان ابدالی افغانی اور ٹیپو سلطان ، پادشاہ دکن سے ملتے ہیں - اُن کے مختلف بیانات میں سے جو حسن و جلال کے اعتبار سے اُن کی بلند شخصیت کے شایان شان ہیں ، ایک یہ بھی ہے :-

چیست ملت ای کہ گوئی لاالہ — با ہزاران چشم بودن یک نگہ
اہل حق را حجت و دعوی یکیست — خیمہ ہای ما جدا ، دلہا یکیست
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب — یک نگہ شو تا شود حق بی حجاب
یک نگاہی را بچشم کم مبین — از تجلیہای توحید است این
مردہ ای از یک نگاہی زندہ شو — بگزر از بی مرکزی ، پائندہ شو
وحدت افکار و کردار آفرین
تا شوی اندر جہان ، صاحب نگین

اس کے بعد وہ جنت سے رخصت ہو کر اس دنیا میں لوٹ آتے ہیں -

زبور عجم ، گلشن راز جدید اور بندگی نامہ ، تینوں ایک ہی مجموعے میں چھپی ہیں - مقدم الذکر دو حصوں میں منقسم ہے اور اس میں ۱۴۱ قطعات ، مسمطات اور غزلیں ہیں - دوسری دو کتابیں مثنوی میں ہیں ، گلشن راز جدید میں انہوں نے محمود شبستری کا تتبع کیا ہے ، نو سوال وضع کیے ہیں اور پھر اُن کے جواب دیے ہیں ، سوالات کا موضوع ، تفکر - حیات

واجب و ممکن - قدیم و محدث - من کیستم - جزو وکل - سالک و مرید - رمز انا الحق - اور سر وحدت ہیں - یہ وہی سوالات ہیں جن پر ہزار ہا سال سے عارفوں، مفکروں اور فلسفیوں نے بحث کی ہے اور طرح طرح کے جواب دیے ہیں، ہم اس مجموعے سے چند منتخبات ناظرین کے لیے یہاں پیش کرتے ہیں:-

نہ برون‌در گزشتم زدرون خانہ گفتم　　سخن نگفتہ‌ای را چہ قلندرانہ گفتم

یارب درون سینہ دل با خبر بدہ　　در بادہ نشّہ را نگرم آن نظر بدہ
خاکم بنور نغمۂ داؤد بر فروز　　ہر ذرۂ مرا پروبال شرر بدہ

بر عقل فلک پیما ترکانہ شبیخون بہ　　یک ذرۂ درد دل از علم فلاطون بہ
آن‌فقر کہ‌بی‌تیغی‌صد کشوردل‌گیرد　　از شوکت دارا بہ، از فرفریدون بہ
درجوی روان ما بی منت طوفانی　　یک‌موج‌اگر خیزدآن موج زجیحون بہ

یا مسلمان رامدہ فرمان کہ جان بر کف بنہ
یا درین فرسودہ پیکر تازہ جانی آفرین
یا چنان کن یا چنین
یا بکش در سینۂ من آرزوی انقلاب
یا د گرگون کن نہاد این زمان و این زمین
یا چنان کن یا چنین

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز　　دگرآشوب قیامت بکف خاک انداز
او بیک دانۂ گندم بزمینم انداخت　　توبیک‌جرعۂ‌آب‌آن‌سوی افلاک‌انداز

یاد ایامی کہ خوردم بادہ ہا با چنگ و نی
جام می در دست من، مینای می دردست وی

بی تو جان من چو آن سازی که تارش درگست
در حضور از سینه من نغمه خیزو پی به پی
آنچه‌من‌در بزم‌شوق‌آورده ام دانی که چیست ؟
یک چمن گل، یک نیستان ناله، یک خمخانه‌می
زنده کن باز آن محبت را که از نیروی او
بوریای ره نشینی در فتد با تخت کی

لالهٔ این چمن آلودهٔ رنگست هنوز — سپر از دست مینداز که جنگست هنوز
فتنه ای را که دوصدفتنه بآغوش بود — دختری هست که‌درمهدفرنگست‌هنوز
ایکه آسوده‌نشینی لب ساحل، برخیز — که ترا کار بگرداب و نهنگست هنوز

تکیه برحجت و اعجاز بیان نیز کنند — کار حق گه بشمشیر سنان نیز کنند
گه باشد که ته خرقه، زره می پوشند — عاشقان بندهٔ حالند و چنان نیز کنند
چون‌جهان کهنه‌شود پاک‌بسوزنداورا — وزهمان آب وگل ایجاد جهان نیز کنند
عشق مانند متاعیست ببازار حیات — گه ارزان بفروشند و گران نیز کنند
تا تو بیدار شوی ناله کشیدم ، ورنه — عشق کاریست که بی‌آه وفغان نیز کنند

عمرهادر کعبه وبتخانه می نالد حیات — تا زبزم عشق یک دانای‌رازآید برون
طرح نومی افگند اندر ضمیر کاینات — ناله هاکزسینهٔ اهل نیاز آید برون
چنگ راگیرید از دستم که کار از دست رفت
نغمه ام خون گشت و از رگهای ساز آید برون

گفتند جهان ما آیا بتو میسازد ؟
گفتم که نمیسازد ، گفتند که برهم زن

ای غنچهٔ خوابیده ، چو نرگس نگران خیز
کاشانهٔ ما رفت بتاراج غمان ، خیز
از نالهٔ مرغ چمن ، از بانگ اذان خیز
از گرمی هنگامه آتش نفسان خیز
از خواب گران ، خواب گران ، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

خورشید که پیرایه بسیمای سحر بست
آویزه بگوش سحر از خون جگر بست
از دشت و جبل قافله ها رخت سفر بست
ای چشم جهان بین ، بتماشاے جهان خیز
از خواب گران ، خواب گران ، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

خاور همه مانند غبار سر راهیست
یک نالهٔ خاموش و اثر باخته آهیست
هر ذرهٔ این خاک گره خورده نگاهیست
از هند و سمر قند و عراق و همدان خیز
از خواب گران ، خواب گران ، خواب گران خیز
از خو ب گران خیز

دریای تو دریاست که آسوده چو صحر است
دریای تو دریاست که افزون نشد و ، کاست
بیگانه آشوب و نهنگست ، چه دریاست !
از سینهٔ چاکش صفت موج روان خیز
از خواب گران ، خواب گران ، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

ناموس ازل را تو امینی ، تو امینی
دارای جهان را تو یساری تو یمینی
ای بندهٔ خاکی تو زمانی تو زمینی
صهبای یقین درکش و از دیر گمان خیز
از خواب گران ، خواب گران ، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

فریاد ز افرنگ و دلا ویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم همه ویرانه ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم ! باز بتعمیر جهان خیز
از خواب گران ، خواب گران ، خواب گران خیز
از خواب گران خیز

زندگی در صدف خویش گهر ساختن است
در دل شعله فر و رفتن ونگداختن است
عشق ازین گنبد در بسته برون تاختن است
شیشه و ماه ز طاق فلک انداختن است
سلطنت نقد دل و دین زکف انداختن است
بیکی داو جهان بردن و جان باختن است
حکمت و فلسفه را همت مردی باید
تیغ اندیشه بروی دو جهان آختن ست
مذهب زنده دلان خواب پریشانی نیست
از همین خاک جهان دگری ساختن است

نیابی در جهان یاری که داند دلنوازی را
بخود گم شو ، نگه دار آبروی عشقبازی را
من آن علم و فراست با پرکاهی نمی گیرم
که از تیغ و سپر بیگانه سازد مرد غازی را
بهر نرخی که این کالا بگیری سودمند افتد
بزور بازوی حیدر بده ادراک رازی را
اگر یک قطره خون داری، اگرمشت پری داری
بیا من با تو آموزم طریق شاهبازی را
اگر این کار را کار نفس دانی چه نادانی !
دم شمشیر اندر سینه باید نی‌نوازی را

بدرگاه سلاطین تا کجا این چهره سائیها
بیاموز از خدای خویش ناز کبریائیها
بیا بر لاله پا کوبیم و بیباکانه می نوشیم
که عاشق را بحل کردند خون پارسائیها

خود را کنم سجودی ، دیر و حرم نمانده
این در عرب نمانده ، آن در عجم نمانده
در برگ لاله و گل آن رنگ و نم نمانده
در ناله هـای مرغان آن زیر و بم نمانده
بی منزل آرمیدند ، پا از طلب کشیدند
شاید که خاکیان را در سینه دم نمانده

گلشن راز جدید :-

نپنداری که من بی باده مستم
مثال شاعران افسانه بستم

نبینی خیر از آن مرد فرو دست
که بر من تهمت شعر و سخن بست

بکوی دلبران کاری ندارم
دل زاری، غم یاری ندارم

دل سنگ از زجاج من بلرزد
یم افکار من ساحل نه ورزد

نهان تقدیرها در پردهٔ من
قیامتـــا بغل پروردهٔ من

دمی در خویشتن خلوت گزیدم
جهـــان لا زوالی آفریدم

مرا زین شاعری خود عار ناید
که در صد قرن یک عطار ناید

بجانم رزم مرگ و زندگانیست
نگاهم بر حیات جاودانیست

زجان خاک ترا بیگانه دیدم
باندام تو جان خود دمیدم

شراری جسته ای گیر از درونم
که من مانند رومی گرم خونم

و گر نه آتش از تهذیب نوگیر
برون خود بیفروز اندرون میر!

بندگی نامه ــ سر زمین مشرق کے فنون جدیده موسیقی اور مصوری کے بارے میں :-

از غلامی دل بمیرد دربدن
از غلامی روح گردد بار تن

مرگها اندر فنون بندگی
من چه گویم از فسون بندگی

نغمهٔ او خالی از نار حیات
همچو سیل افتد بدیوار حیات

از نی او آشکارا راز او
مرگ یک شهراست اندر ساز او

نـــا توان و زار میسازد ترا
از جهان بیزار میسازد ترا

من نمی‌گویم که آهنگش خطاست
بیوه زن را این‌چنین شیون رواست

نغمه باید تند رو مانند سیل
تا برد از دل غمان را خیل خیل

نغمهٔ روشن چراغ فطرتست
معنی او نقشبند صورتست

نغمه گر معنی ندارد مرده ایست
سوز او از آتش افسرده ایست

" معنی آن باشد که بستاند ترا
بی نیاز از نقش گرداند ترا

معنی آن نبود که کور و کر کند
مرد را بر نقش عاشق تر کند"

مطرب ما جلوهٔ معنی ندید
دل بصورت بست و از معنی دمید

زندگی بی قوت اعجاز نیست
هر کسی دانندهٔ این راز نیست

آن هنرمندی که بر فطرت فزود
راز خود را برنگاه ما گشود

آفریند کائنات دیگری
قلب را بخشد حیات دیگری

در غلامی عشق جز گفتار نیست
کار ما گفتار ما را یار نیست

دین و دانش را غلام ارزان دهد
تا بدن را زنده دارد ، جان دهد

یک زمان بارفتگان صحبت گزین
صنعت آزاد مردان هم ببین

خویش را از خود برون آورده اند
اینچنین خود را تماشا کرده اند

درمن آن نیروی الا الله نیست
سجده ام شایان این درگاه نیست

عشق مردان نقد خوبان را عیار
حسن را هم پرده در، هم پرده دار

از محبت جذبه‌ها گردد بلند
ارج میگرد ازو نا ارجمند

بی محبت زندگی ماتم همه
کار و بارش زشت و نا محکم همه

عشق صیقل میزند فرهنگ را
جوهر آئینه بخشد سنگ را

گرمی افکار ما از نار اوست
آفریدن ، جان دمیدن کار اوست

عشق مور ومرغ و آدم را بس است
عشق تنها هردوعالم را بس است

دلبری بی قاهری جادوگری است
دلبری با قاهری پیغمبری است

هر دو را در کارها آمیخت عشق
عالمی در عالمی انگیخت عشق

"پیام مشرق" کا پہلے تعارف کراچکا ہوں اور اس میں سے مختلف موضوعات پر شعر بھی نقل کیے گئے ہیں - یہاں ایک غزل مستزاد

''کرم شب تاب''* پر اکتفا کی جاتی ہے :-

یک ذرۂ بی مایہ متاع نفس اندوخت
شوق این قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت

پہنای شب افروخت

واماندہ شعاعی کہ گرہ خورد و شرر شد
از سوز حیاتست کہ کارش ہمہ زر شد

دارای نظر شد

پروانۂ بی تاب کہ ہر سوتگ و پو کرد
برشمع چنان سوخت کہ خود را ہمہ او کرد

ترک من و تو کرد

ای کرمک شب، تاب سراپای تو نور است
پرواز تو یک سلسلۂ غیب و حضور است

آئین ظہور است

در تیرہ شبان، مشعل مرغان شبستی
آن سوز چہ سوز است کہ در تاب و تبستی

گرم طلب استی

مائیم کہ مانند تو از خاک دمیدیم
دیدیم تپیدیم، ندیدیم تپیدیم

جای نرسیدیم

گویم سخن پختہ و پرورده و تہ دار
از منزل گم گشتہ مگو، پای برہ دار

این جلوہ نگہ دار

* عنوان نظم ''کرمک شب تاب'' ہے۔ مصنف اسے غزل مستزاد کہ کر پکارتا ہے۔ اصطلاحاً یہ نظم غزل مستزاد سے قدرے مختلف ہے اور اسے جدید طرز کی نظموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ (مترجم)

کتاب ''مسافر'' ایک سفر کی داستان ہے جب علامہ مرحوم ۱۹۳۳ء میں افغانستان میں گئے تھے اور آن اشعار پر مشتمل ہے جو انہوں نے سرحد کے لوگوں سے خطاب کرکے کہے۔ اس کتاب میں اور بھی قطعات ہیں جن کے عنوان حسب ذیل ہیں: در حضور شاہ شہید (ٹیپو سلطان) بابر، حکیم سنائی، سلطان محمود غزنوی، احمد شاہ بابا کی قبروں کی زیارت کے متعلق، خطاب بہ سلطان ظاہر شاہ افغان۔ یہ کتاب ایک اور کتاب کے ہمراہ چھپی ہے، جس کا نام ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مثنوی ہے جس میں دیار حبش پر اطالوی حملے کا تذکرہ ہے۔ اس میں اور بھی اشعار ہیں: حکمت موسیٰ۔ حکمت فرعون ۔ لاالہ الا اللہ۔ فقر۔ مرد آزاد۔ اسرار شریعت۔ یہ چند شعر اسی کتاب سے ہیں:-

امتان را زندگی جذب درون — کم نظر این جذبہ را گوید جنون
مومن از عزم و توکل قاہراست — گرندارد این دو جوہر کافراست
عصر ما ما را ز ما بیگانہ کرد — از جمال مصطفیٰ بیگانہ کرد
تا خودی در سینۂ ملت بمرد — کوہ کاہے کرد وباد او را ببرد

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد — زیر گردون رسم لا دینی نہاد
زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست — من از حرم نگزشتم کہ پختہ بنیاداست
درون دیدہ نگہ‌دارم اشک خونین‌را — کہ‌من فقیرم‌واین دولت‌خداداداست

''ارمغان حجاز'' جو آن کی وفات کے بعد چھپی تھی، دو زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ اس کی تین چوتھائی فارسی میں ہے اور ایک چوتھائی اردو میں، فارسی حصے میں ۳۹۴ رباعیاں * ہیں جن کے الگ الگ موضوع

* اصطلاحاً انہیں قطعات کہنا چاہیے کہ رباعی کا وزن مخصوص ہوتا ہے۔ لیکن علامہ مرحوم اس خصوصیت کے پابند نہیں تھے اور سہولت کے اعتبار سے ان قطعات کو رباعیات کہتے تھے۔

هیں مثلاً خودی، اناالحق ، صوفی ، ملاّ ، شعرای عرب، خلافت ، ملوکیت، ترک عثمانی ، دختران ملت ، تعلیم ، تلاش رزق ، جبر و اختیار ، موت و ابلیس - چند رباعیاں حسب ذیل هیں :-

جہان از خود برون آوردۂ کیست
جمالش جلوۂ بی پردۂ کیست
مرا گوئی که از شیطان حذر کن
بگو بامن که او پروردۂ کیست

متاع من دل درد آشنای است
نصیب من فغان نارسای است
بخاک مرقد من لاله خوشتر
که هم خاموش و هم خونین نوای است

نداند جبرئیل این های وهو را
که نشناسد مقام جستجو را
بپرس از بندۂ بیچارۂ خویش
که داند نیش و نوش آرزو را

مسلمان فاقه مست و ژنده پوش است
زکارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقش دگر ملت بریزیم
که این ملت جهان را باردوش است

مریدی فاقه مستی گفت با شیخ
که یزدان را زحال ما خبر نیست
بما نزدیکتر از شه رگ ماست
ولیکن از شکم نزدیکتر نیست

بدن واماند و جانم درتگ و پوست
سوی شهری که بطحا در ره اوست
تو باش اینجا و با خاصان بیامیز
که من دارم هوای منزل دوست

امیر کاروان آن اعجمی کیست !
سرود او باهنگ عرب نیست
زند آن نغمه کز سیرابی او
خنک دل دربیابانی تو ان زیست

دل خود را اسیر رنگ و بو کرد
تهی از ذوق و شوق و آرزو کرد
صغیر شائبازان کم شناسد
که گوشش باطنین پشّه خو کرد

شبی پیش خدا بگریستم زار
مسلمانان چرا زارند و خوارند
ندا آمد : " نمیدانی که این قوم
دلی دارند و محبوبی ندارند "

نه شعراست اینکه بروی دل نهادم
گره از رشتهٔ معنی گشادم
بامیدی که اکسیری زند عشق
مس این مفلسان را تاب دارم

تو گفتی : از حیات جاودان گوی
بگوش مرده ای پیغام جان گوی
ولی گویند این ناحق شناسان
که تاریخ وفات این و آن گوی

غریبی ، دردمندی ، نی نوازی
ز سوز نغمه ای در خود گدازی
تو میدانی چه می جوید ، چه خواهد
دلی از هر دو عالم بی نیازی

می از میخانه مغرب چشیدم
بجان من که درد سر خریدم
نشستم با نکویان فرنگی
از آن بی سوز تر روزی ندیدم

غریبم درمیان محفل خویش
تو خودگو باکه گویم مشکل خویش
از آن ترسم که پنهانم شود فاش
غم خود را نگویم بادل خویش

نگیرد لاله و گل رنگ و بویم
درون سینه ام مرد آرزویم
غم پنهان بحرف اندر نگنجد
اگر گنجد چه گویم باکه گویم

چو رومی در حرم دادم اذان من
از او آموختم اسرار جان من
بدو رفتهٔ عصر کهن ، او
بدو رفتهٔ عصر روان ، من

خدا آن ملتی را سروری داد
که تقدیرش بدست خویش بنوشت
بآن ملت سروکاری ندارد
که دهقانش برای دیگران کشت

اناالحق جز مقام کبریا نیست　　سزای او چلیپا هست یانیست
اگر فردی بگوید سرزنش به　　اگر قومی بگوید ناروا نیست

به پند صوفی و ملا اسیری　　حیات از حکمتِ قرآن نگیری
بآیاتش تراکاری جز این نیست　　که از یاسینِ او آسان بمیری

بکام خود دگر آن کهنه می ریز　　که با جامش نیرزد ملک پرویز
ز اشعار جلال الدین رومی　　بدیوار حریم دل بیاویز

بگیر از ساغرش آن لاله رنگی　　که تاثیرش دهد لعلی بسنگی
غزالی را دل شیری ببخشد　　بشوید داغ از پشت پلنگی

نصیبی بردم از تاب وتب او　　شبم مانند روز از کوکب او
غزالی در بیابان حرم بین　　که ریزد خندهٔ شیر از لب او

خیالش با مه و انجم نشیند　　نگاهش آن سوی پروین ببیند
دل بیتاب خود را پیش او نه　　دم او رعشه از سیماب چیند

ز رومی گیر اسرار فقیری　　که آن فقر است محسود امیری
حذر زان فقر و درویشی که از وی　　رسیدی بر مقام سر بزیری

می روشن ز تاک من فرو ریخت　　خوشا مردی که در دامانم آویخت
نصیب از آتشی دارم که اول　　سنائی از دل رومی برانگیخت

در صدفتنه را بر خود کشادی
دو گامی رفتی و از پا فتادی

برهمن از بتان طاقِ خود آراست
تو قرآن را سر طاق نهادی

نگه دارد برهمن کار خود را
نمیگوید بکس اسرار خود را

بمن گوید که از تسبیح بگذر
بدوش خود برد زنّار خود را

نهنگی بچهٔ خود را چه خوش گفت
بدین ما حرام آمد کرانه

بموج آویز و از ساحل بپرهیز
همه دریاست ماوا آشیانه

پریشان هر دم ما از غمی چند
شریک هر غمی نامحرمی چند

ولیکن طرح فردای تو آن ریخت
اگر دانی بهای این دمی چند

برون کن کینه را از سینهٔ خویش
که دود خانه از روزن برون به

زکشت دل مده کس را خرابی
مشو ای دهخدا غارتگر ده

بشر تا از مقام خود فتادست
بقدر محکمی آو را کشادست

گنه هم می شود بی لذت و سرد
اگر ابلیس تو خاکی نهادست

مشو نخچیر ابلیسان این عصر
خسان را غمزهٔ شان ساز گار است

اصیلان را همان ابلیس خوشتر
که یزدان دیده و کامل عیار است

حریف ضرب آو مرد تمام است
که آن آتش نسب والا مقام است

نه هر خاکی سزاوار نخ اوست
که صید لاغری بروی حرام است

مقام شوق بی صدق ویقین نیست — یقین بی صحبت روح‌الامین نیست
گر از صدق و یقین داری نصیبی — قدم بی باک نه کس در کمین نیست

بهشتی بهر پاکان حرم هست — بهشتی بهر ارباب همم هست
بگو هندی مسلمان را که خوش باش — بهشتی فی سبیل الله هم هست

خاتمے کے طور پر ہم جاوید نامے کے ان اشعار سے پڑھنے والوں کے دماغ کو معطر کرنا چاہتے ہیں :-

زنده ای یا مرده ای یا جان بلب — از سه شاهد کن شهادت را طلب
شاهد اول شعور خویشتن — خویش را دیدن بنور خویشتن
شاهد ثانی شعور دیگری — خویش را دیدن بنور دیگری
شاهد ثالث شعور ذات حق — خویش را دیدن بنور ذات حق
پیش این نور ار بمانی استوار — حیّ و قائم چون خدا خود را شمار
بر مقام خود رسیدن زندگی است — ذات را بی پرده دیدن زندگی است
مرد مومن در نسازد با صفات — مصطفیٰ راضی نشد الاّ بذات
چیست معراج ؟ آرزوی شاهدی — امتحانی رو بروی شاهدی
شاهد عادل که بی تصدیق او — زندگی مارا چو گل را رنگ و بو
در حضورش کس نماند استوار — ور بماند هست او کامل عیار
ذره ای از کف مده تابی که هست — پخته گیر اندر گره تابی که هست
تاب خودرا برفزودن خوشتر است — پیش خورشید آزمودن خوشتر است
پیکر فرموده را دیگر تراش — امتحان خویش کن ، موجود باش
اینچنین موجود محمود است وبس — ورنه نار زندگی دود است و بس

ہمارا ارادہ تھا علامہ اقبال کے حالات اور اُن کے خیالات و اشعار کے بارے میں مختصراً کچھ لکھا جائےاور اپنے ہم وطنوں سے اُن کا تعارف کرایا جائے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ جب ایران میں شعر و شاعری زوال و انحطاط کی طرف جارہی ہے ہمارے ہمسایہ ملک میں ایک عظیم الشان شاعر ہے جس کے افکار بلند ہیں اور وہ صاحب ذوق ہونے کے علاوہ غیر معمولی ذہانت اور فطانت کا مالک ہے ۔ اسے قدیم و جدید علوم پر دسترس حاصل ہے ۔ اس کے فارسی اشعار کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی شہرت یورپ اور امریکہ تک پھیل چکی ہے ۔ اور اس نے ادبیات فارسی کے نام کو چمکایا ہے اور ہندوستان میں تحصیل زبان فارسی کے شوق کو از سر نو تازہ کیا ہے ۔ لیکن بات کچھ اندازے سے بڑھ گئی اور پھر بھی حق مطلب کے ادا نہ ہونے کا احساس ہے ۔ امید ہے کہ میں ایک روز ''کلیات'' اقبال کی طباعت و اشاعت کر سکوں گا ۔ لیکن اگر یہ کام میرے ہاتھوں سے سرانجام نہ پاسکے تو دوسرے لوگ اس کام کو ہاتھ میں لیں گے ۔ محمد گلندام کے زمانے سے ایران میں ایک جنون یہ پیدا ہو گیا ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہر شاعر کے کلام کو ترتیب ابجد سے شائع کیا جائے (یہاں تک کہ مثنوی کے اشعار کو قافیہ ہی کے اعتبار سے چھاپتے ہیں) اس سے بچنا چاہیے ۔ علامہ موصوف کے کلام کو اسی طرح طبع کرنے کی ضرورت ہے جس طرح انھوں نے خود شائع کیا ہے ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو حواشی انھوں نے اُردو میں لکھے ہیں انھیں فارسی میں ترجمہ کرکے شامل کر لیا جائے اور اس پر ایسی توضیحات کا اضافہ کردیا جائے جو ایرانیوں کے لیے موزوں ہوں ۔ اور اگر چاہیں کہ پڑھنے والے شعروں کو آسانی سے سمجھ لیں ، تو متعدد فہرستیں جو مضامین اور قوافی وغیرہ پر مشتمل ہوں ، تمام تصنیفات کو سامنے رکھ کر ترتیب دی جائیں ۔

ہم نژادی ، ہم لسانی ، دینی اور علمی تعلق ، سیاسی اور تجارتی

رابطہ جو ہمارے اور پاکستان اور ہندوستان کے درمیان موجود ہے، وہ اس حد تک وسیع ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں اس کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ بالخصوص جب کہ کتاب انہی لوگوں میں سے ایک ہستی کے متعلق ہو۔ اگر صرف فارسی زبان ہی کو لیا جائے تو یہ موضوع بھی اس قابل ہے کہ اس پر چند کتابیں لکھی جائیں، جیسا کہ خود اہل ہندوستان نے لکھی ہیں۔ یہاں تک کہ زبان فارسی پر جس کا سلاطین مغول کے دربار میں (امیر تیمور گورگانی کا خاندان) چرچا تھا، متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ اور ادھر یہ حالت ہے کہ اس وسیع سرزمین کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں ایک بھی کتاب ہمارے ملک میں موجود نہیں۔

اب ایشیا کا یہ ملک عظیم، آزاد اور خود مختار ہوچکا ہے (اگرچہ اس کی تقسیم بادام دو مغز کی صورت رکھتی ہے) اب ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں کہ ہم کہیں ہمیں اہل ہند سے رابطہ و اتحاد پیدا کرنے نہیں دیتے۔ ان آخری دو سو سالوں میں فارسی زبان ہندوستان میں محو نہیں ہوئی، اور یہ بات خود ہندوستانیوں کی ہمت کا نتیجہ ہے، یہ وسیع سرزمین عنقریب ایشیا کی اہم ترین اور معزز ترین مملکت ہوگی۔ اگر مادی مصلحت اور منفعت کی رو سے بھی دیکھا جائے تو پھر بھی یہ مناسب ہے کہ ہم پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ رابطہ محبت و مودت استوار کریں، خصوصاً مسلمان اور ہندو بھائیوں کے درمیان زبان فارسی کی ترویج و اشاعت کی کوشش کریں، وہ فارسی کتابیں جو یہاں خط نستعلیق میں چھپی ہیں، ان لوگوں کے لیے بھیجیں اور جو اچھی فارسی کتابیں انھوں نے لکھی ہیں ان میں سے کچھ ایران میں شائع کی جائیں۔

پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ ہر سال اپنے کچھ آدمی زبان فارسی کی تحصیل کے لیے ایران میں بھیجیں تاکہ وہ ہمارے مدرسوں میں تعلیم حاصل کریں (بشرطیکہ ہم انہیں فصیح و شیریں فارسی پڑھائیں نہ کہ وہ زبان جو ٹیڑھی ترچھی زبان ہے جسے ہمارے ہموطنوں میں سے بعض ارباب نے فارسی کا نام دیکر وضع کیا ہے) اور ہم خود ان دونوں ملکوں میں کچھ طلباء کو تعلیم کے لیے روانہ کریں، ایسے مترجم بھی رکھے جائیں جو اردو اور دیگر ہندی زبانوں سے بخوبی آشنا ہوں اور ہندوستانی زبان کی اہم کتابوں کو فارسی میں منتقل کر سکیں، ایران اور پاکستان اور اسی طرح ایران و ہندوستان کے باہمی ثقافتی انجمنیں قائم کی جائیں ان دونوں ملکوں کے علماء، اساتذہ، شعراء اور ادبا کو دعوت دی جائے کہ وہ ایران میں تشریف لائیں اور دو ایک مہینے ہمارے مہمان رہیں اور ہماری تعلیم گاہوں میں لیکچر اور درس دیں، اور اسی طرح ہمارے ادیب اور عالم بھی اس سرزمین کی سیر وسیاحت کو جائیں۔ لیکن افسوس

جملہ در جنب و جوش و ما خاموش
همه در کشت و کار و ما بیکار

مسٹر کریم احمد خان طابع و ناشر و معتمد بزم اقبال نے رپن پریس
بلی روڈ ، لاہور سے چھپوا کر دفتر بزم اقبال ، ۲ نرسنگھ داس
گارڈن ، کلب روڈ ، لاہور سے شائع کیا ۔